نئی صدی ہجری کا تحفہ

پندرھویں صدی ہجری

ماضی و حال کے آئینہ میں

ایک تبصرہ - ایک جائزہ - ایک پیغام

(مع اضافۂ جدیدہ)

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مجلسِ نشریاتِ اسلام
اے۔۳۰۔ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی۔ ۷۴۶۰۰

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

- ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
- رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند
- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ
- صدر مجلس انتظامی ومجلس علمی دارالمصنفین اعظم گڑھ
- رکن عربی اکادمی دمشق
- رکن مجلس شوریٰ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
- رکن مجلس تاسیس رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ
- رکن مجلس عاملہ موتمر عالم اسلامی بیروت
- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ
- صدر رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ
- رکن مجلس انتظامی اسلامک سینٹر جنیوا
- سابق وزیٹنگ پروفیسر دمشق یونیورسٹی ومدینہ یونیورسٹی
- صدر آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی آکسفورڈ۔

نام کتاب ——— پندرھویں صدی ہجری
تصنیف ——— مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
طباعت ——— مولائی پرنٹنگ پریس۔ کراچی
ضخامت ——— ۳۸ صفحات
ٹیلیفون : 6601817

اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوۃ قاسم سینٹر اردو بازار کراچی

ناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد ۱ کراچی "۶۰۰"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

پندرھویں صدی ہجری کا آغاز اگرچہ یکم محرم ۱۴۰۱ھ (۱۰ رنومبر ۱۹۸۰ء) سے ہونے والا تھا، لیکن عالم اسلام میں بلکہ اس سے باہر بھی اس کی آمد آمد کا ۱۴۰۰ھ ہی سے شور بلند ہو گیا تھا، اور اس کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں، مختلف سیاسی اسباب، حوادث و واقعات، اور متعدد اسلامی تحریکوں کے اثر سے اس تبدیلی کو (جو ہر صدی کے اختتام پر ہوتی ہے) وہ اہمیت حاصل ہو گئی تھی، جو اس سے پہلے مشکل سے کسی نئی صدی کو حاصل ہوئی ہو گی، عرب و غیر عرب ممالک میں جا بجا مختلف ناموں و عنوانوں سے کانفرنسیں اور سیمنار منعقد کئے جا رہے تھے، حتیٰ کہ خود ہندوستان کی سیکولر حکومت نے بھی اس کا جشن منایا، اور یادگاری ٹکٹ جاری کئے، اسلامی اخبارات و رسائل کے خصوصی نمبروں کے نکالنے کی تیاری شروع ہوئی، اس سلسلہ میں مختلف مرکزوں، تنظیموں اور اسلامی رسائل و مجلات کی طرف سے راقم سطور سے مقالے کی فرمائش ہوئی، اور ان جلسوں میں شرکت کی دعوت دی گئی، جو اس موقعہ پر منعقد کئے جا رہے تھے۔

لیکن اس عالمگیر ہماہمی کے باوجود مختلف طبعی اسباب کی بنا پر راقم کی طبیعت میں اس موضوع پر کچھ لکھنے یا کسی اجتماع میں تقریر کرنے کی تحریک نہیں پیدا ہوئی، عالمِ اسلام کی موجودہ صورت حال، اور تازہ واقعات و حوادث نے طبیعت کو ایسا افسردہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے اندر نئی صدی کے استقبال کا کوئی جوش و ولولہ نہیں پاتا تھا، اس لئے اس نے زیادہ تر ان فرمائشوں اور دعوتوں کے جواب میں معذرت سے کام لیا، لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا، طلبہ کی اسلامی تنظیم (STUDENTS ISLAMIC-MOVEMENT) نے جو S.I.M. کے نام سے مشہور ہے، ملک میں پندرھویں صدی تقریبات کا ہفتہ منانے کا فیصلہ کیا، اس ہفتہ کا آغاز انھوں نے یکم نومبر ۱۹۸۰ء (مطابق ۲۲ ذی الحجہ ۱۴۰۰ھ) کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کے ایک جلسہ سے کرنا چاہا، اور اس کے افتتاح کے لئے مجھ سے اصرار کیا، میں نے ان کے اصرار کی بنا پر اور ان نوجوانوں کی خاطر سے جو بڑے ولولہ اور امنگ سے یہ تقریبات منا رہے تھے، اس کو منظور کر لیا، ذہن میں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ میں چند منٹ تقریر کروں گا، اور بعض اہم پہلوؤں کی طرف متوجہ کر دوں گا، اس دن مجھے ضلع ایٹہ کی ایک دینی تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لئے سفر کرنا تھا، اور وقت میں اتنی ہی گنجائش تھی کہ میں ہال سے سیدھے اسٹیشن پہونچ جاؤں، لیکن ماحول کا اثر، سامعین کی طلب اور شوق، اور سب سے بڑھ کر ارادۂ الٰہی، کہ جب تقریر شروع کی تو بالکل بھول گیا کہ مجھے سفر کرنا ہے، اور ابھی ٹرین پکڑنی ہے، شاید اگر قلم ہاتھ میں لے کر اس موضوع پر لکھنے کی کوشش کرتا تو اتنی آمد نہ ہوتی۔

تقریر ٹیپ کرلی گئی تھی، جب قلم بند ہوکر وہ میرے سامنے آئی تو تقریر و تحریر کے
مزاج کے اختلاف' اور ماحول کے فرق کی وجہ سے اس میں جا بجا اضافوں، ترمیم اور
تنقیح کی ضرورت محسوس ہوئی، کئی باتیں اپنے حافظہ پر اعتماد کرکے کہی گئی تھیں، بعض تاریخی
کتابوں کے اقتباسات تھے، جو اپنی یاد سے سنا دیئے گئے تھے، تواریخ وسنین' اور حوالوں کی
کمی تھی، بعض اشارات تھے، جن کی توضیح و تفصیل کی ضرورت تھی، راقم نے ان سب
گوشوں کی طرف توجہ کی' اور ان لوگوں کی مدد اور رہنمائی کے لئے جو مزید وضاحت
اور تفصیل کے طالب و مشتاق ہوں' بڑی کتابوں اور ماخذوں کا حوالہ دے دیا، تاکہ یہ مختصر
مضمون مفصل اور مفید کتابوں کے مطالعہ کا محرک اور ذریعہ بن جائے، اس طرح ایک
برجستہ تقریر کو جو بغیر کسی تیاری کے ہوئی تھی' ایک تاریخی مضمون کی شکل میں ڈھال دیا۔

اتفاق سے اس کے کچھ دن بعد آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ کے اسٹیشن نے مجھ سے
اس موضوع پر چند کلمات کہنے کی فرمائش کی، موضوع کا ایک گوشہ اس مختصر گفتگو میں
بھی آگیا، جس کو راقم نے اس مضمون کی تمہید کے طور پر شامل کر دیا۔

نظر ثانی' اضافہ' اور ترمیم کے بعد جب اس مضمون پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ
اب یہ مضمون اس قابل ہو گیا ہے کہ اس کو شائع کر دیا جائے' وہ ایک مختصر تبصرہ'
جائزہ' اور پیغام بن گیا ہے' اور اس میں چند اہم صدیوں کی تاریخ کا عطر آگیا ہے'
مصنف کی اس میں ایک ذاتی غرض اور مصلحت بھی مضمر ہے کہ وہ اس طرح روز روز
اس موضوع پر خیالات کے اظہار' اور مضامین و تقریروں کی فرمائش سے بچ جائے گا'

جن کا سلسلہ جاری ہے، اور غالباً عرصہ تک جاری رہے گا، اس کو جو کچھ کہنا تھا، یا کہنا چاہیئے، وہ تقریباً تمام اس مضمون میں آگیا ہے۔

اگر اس مختصر مقالہ میں (جو اصلاً ایک تقریر کی شکل میں تھا) کسی صاحب نظر کو کوئی خلا یا نقص نظر آئے، یا کسی اہم شخصیت یا ادارہ کا نام نہ ملے تو اس کو سمجھنا چاہیئے کہ یہ پچھلی صدیوں میں اصلاحی و تجدیدی کوششوں، اور اسلامی جدوجہد کی مفصل روداد، یا اہم دینی و اصلاحی شخصیتوں یا تحریکوں کی ڈائرکٹری نہیں ہے، یہ چند آخری صدیوں کی اصلاحی کوششوں کا مختصر تذکرہ اور ایک مختصر جائزہ ہے، اور اس کا پیغام ہے کہ ع

تو خود حدیث مفصّل بخواں ازیں مجمل

اب وہ راقم سطور، اور "مجلس تحقیقات ونشریات اسلام" کی طرف سے محض سال نو کا ایک تحفہ ہی نہیں، نئی صدی کا ایک تحفہ، اور اس کے لئے ایک پیغام ہے، امید ہے کہ ان خامیوں سے چشم پوشی کی جائے گی، جو ایک تقریر اور مضمون میں ہوتی ہیں، اور اس مخلصانہ تحفہ کو قبول کیا جائے گا۔

ابوالحسن علی ندوی

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یکم محرم الحرام سنہ ۱۴۰۱ھ ۱۰ر نومبر سنہ ۱۹۸۰ء

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

اس وقت دنیا میں پندرھویں صدی ہجری کی آمد آمد کا چرچا ہے، اس صدی کا آغاز محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واقعۂ ہجرت سے ہوتا ہے، عام طور پر صدیوں کا آغاز کسی بڑی شخصیت کی پیدائش یا وفات، قیام سلطنت یا عظیم فتوحات سے ہوا ہے[1] اور اس سے ایک مستقل تقویم (جنتری) وجود میں آئی ہے، لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے دین کا نام بھی اپنے پیغمبر کے نام پر نہیں رکھا، بلکہ پیغام پر رکھا ہے، اسلام کسی شخصیت کا نام نہیں ہے، اسلام ایک فیصلہ اور طرز عمل کا نام ہے، یعنی خدا کے احکام کے سامنے سر جھکا دینا، یہی خصوصیت اس صدی کی ہے، اس صدی کا آغاز بھی، کسی بڑی شخصیت، یہاں تک کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب و محترم شخصیت سے بھی نہیں ہوتا، جو مسلمانوں کے عقیدہ اور نظر میں اللہ کے بعد سب سے محبوب و محترم شخصیت ہے۔ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

لیکن نہ آپؐ کی پیدائش سے اس صدی کا تعلق ہے، اور نہ آپ کی وفات سے، حالانکہ دونوں دنیا کے اہم ترین واقعات ہیں، بلکہ آپ کے واقعۂ ہجرت سے۔

---

[1] مثلاً عیسوی تقویم (جنتری) جو ساری دنیا میں رائج ہے حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب ہے، بکرمی جنتری کی جو ہندوستان میں رائج تھی نسبت بکرماجیت بادشاہ کی طرف ہے، ایران میں اور زردشتیوں کے یہاں یزدگرد ثالث کے دو سنہ مستعمل تھے، ایک اس کی تخت نشینی سے شروع ہوتا تھا دوسرا اس کی موت سے، گریگورین کیلنڈر پوپ گری گوری سیزدہم کی طرف منسوب ہے جو ۱۵۸۲ء سے (باستثنائے روس و یونان) تمام یورپ میں جاری ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نئی اسلامی صدی شروع ہوگی تو ایک پیغام لے کر آئیگی وہ محض ایک شخصیت یا جماعت کی یاد تازہ نہیں کرتی، بلکہ ایک پیغام کی یاد تازہ کرتی ہے، یعنی یہ کہ آپؐ نے ایک عظیم مقصد کے لئے اپنے عزیز وطن کو خیر باد کہا، اور ایک نئے شہر میں بود و باش اختیار کی، یہ بات ایک پیغام، اور ایک بڑے اقدام کو یاد دلاتی ہے آپ نے اتنا بڑا اقدام اپنی یا اپنے چند دوستوں اور ساتھیوں کی جان بچانے کے لئے نہیں کیا تھا، بلکہ خدا کے پیغام کو محفوظ کرنے اور اس کو ساری دنیا تک پہونچانے کا موقعہ مہیا کرنے کے لئے کیا تھا، تو یہ صدی ہم کو یاد دلاتی ہے کہ کسی عظیم مقصد کے لئے عزیز سے عزیز چیز کو چھوڑا جا سکتا ہے، اور اتنا بڑا اقدام کیا جا سکتا ہے، دنیا کی تاریخ میں یہ ایک ہمت افزا اور حیات آفریں پیغام ہے، جو ہمت دلاتا ہے کہ کوئی چیز خواہ کیسی ہی نرالی اور کیسی ہی اجنبی ہو، اور اس کی راہ میں کیسی ہی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں، اور کیسے ہی ناسازگار حالات ہوں، اور اس کو کیسی ہی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے، اگر اس سے انسانیت کی فلاح مقصود ہے، نیت میں خلوص ہے، اور ارادہ میں عزم و پختگی، تو ساری مخالفتوں کے باوجود وہ پیغام زندہ رہے گا، اور اس کی قسمت میں کامیابی و کامرانی لکھی ہوئی ہے۔

اس لئے یہ پندرھویں صدی صرف مسلمانوں ہی کو ہمت کا پیغام نہیں دیتی، بلکہ پوری نوع انسانی کو اور ان سب لوگوں کو جو کوئی صحیح مقصد رکھتے ہیں، کسی مفید دعوت کے علمبردار ہیں، کسی اچھی بات کے لئے جد و جہد کرنا چاہتے ہیں، کسی عظیم مقصد کے لئے

وہ کھڑے ہوئے ہیں، ان سب کے لئے حیاتِ نو کا پیغام ہے۔

لیکن یہ پندرھویں صدی مسلمانوں اور بالواسطہ انسانیت کے حق میں مبارک ثابت ہو گی، یا (خدانخواستہ) منحوس و نامبارک؟ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا، وہ چند فیصلے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں، اور وہ قرآنی حقیقتیں اور صداقتیں جو ابدی ہیں، ان میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ :-

وَاَنۡ لَّيۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى — اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔ (سورۂ النجم ـ ۳۹)

انسان کو اپنی زندگی، اور زندگی کے بعد کی زندگی میں اتنا ہی حصہ ملتا ہے جس کی اس نے کوشش کی، اس کے حصّے میں اس کی سعی آئے گی، اور سعی کے نتائج آئیں گے، اس کے بعد فرماتا ہے :-

وَاَنَّ سَعۡيَهٗ سَوۡفَ يُرٰى۔ — اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی۔ (سورۂ النجم ـ ۴۰)

یہ ایک حیات آفریں پیغام ہے، تمام انسانی نسلوں، اور تاریخ کے تمام دوروں کے لئے کہ انسان کی کوشش کا نتیجہ ضرور برآمد ہو گا، اور اس کے اثرات و نتائج مشاہدہ میں آئیں گے۔

ثُمَّ يُجۡزٰىهُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰى — پھر اس کو اس کی کوشش کا بھرپور بدلہ ملے گا۔ (سورۂ النجم ـ ۴۱)

انسانی سعی کی حسن نتیجہ خیزی، اور بار آوری کا اس آیت میں اظہار کیا گیا ہے، وہ ایک حوصلہ افزا اور حیات بخش پیغام ہے، اقبال نے انسان کے لئے کہا تھا ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

میں صدی کے متعلق یہی شعر پڑھوں گا "خاکی" کی جگہ آپ "صدی" کہہ لیجئے، یہ پندرھویں صدی، اور وہ صدیاں جو گذر چکی ہیں، سب کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت میں نہ مبارک ہیں، نہ منحوس، اس کے مبارک و منحوس ہونے کا فیصلہ انسانوں کی کوششوں کے صحیح رخ پر ہونے اور صحیح طریقہ پر انجام پانے پر منحصر ہے، ہم کسی صدی کے متعلق، بلکہ کسی سال، کسی مہینہ، کسی دن، کسی ساعت کے متعلق بھی پہلے سے یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ مبارک ہوگی یا منحوس؟ اسلام میں برکت و نحوست کے اس بے لچک نظریہ کا وجود نہیں، جو بعض جاہلی قوموں میں (جو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے محروم رہی ہیں) اب بھی پایا جاتا ہے، ہم یہ کہیں کہ آنے والی صدی بہت مبارک ہے، اور یہ ملت کی اقبال مندی کا دور ہوگا، یا یہ صدی کسی ملت، یا تقدیر انسانی کے حق میں منحوس ثابت ہوگی، یہ بالکل اسلامی طرز فکر نہیں ہے، اور کتاب و سنت سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی، اس لئے کہ یہ تخیل کہ فلاں وقت دائمی طور پر اپنی جگہ پر مبارک ہے یا منحوس، انسانی قوت عمل کو سخت نقصان پہونچانے والا ہے، اگر انسان پہلے سے یہ سمجھ جائے کہ کوئی ساعتِ نحس آنے والی ہے، یا فلاں گھڑی منحوس ہے، تو اس کے قویٰ مضمحل ہو جائیں گے

اور اس کی قوت عمل کیا بلکہ قوت فیصلہ بھی جواب دے جائیگی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہم پرستی، بلکہ غالیانہ خوش عقیدگی، اور شخصیت پرستی کی جڑ پر تیشہ چلایا، ایک مرتبہ سورج گرہن ہوا، خدا کو اس امت کی تربیت مقصود تھی، اس سے کچھ پہلے ہی فرزند رسول سیدنا ابراہیم کا انتقال ہوا تھا[1]، عرب جاہلیت سے قریب العہد تھے، اور اس کے اثرات تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے، واقعہ بھی ایسا غیر معمولی اور ایسا جذباتی تھا کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے یہ نکلا کہ کیوں نہ ہو، اللہ کے پیغمبر کے فرزند کا انتقال ہو اور سورج اس سے متاثر نہ ہو؟ دنیا کا کوئی داعی، کوئی پیشوا، کسی تحریک کا علم بردار، کسی انسانی جماعت کا قائد ہوتا تو کم سے کم درجہ یہ تھا کہ اگر اس کی تردید نہ کرتا تو خاموش رہتا کہ یہ بات ہماری تحریک کے مفاد میں جاتی ہے، میں نے تو کہلوائی بھی نہیں خود بخود لوگوں کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ سورج گرہن اللہ کے رسول (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بیٹے کے انتقال پر ہوا ہے، اس کی تردید کچھ ضروری نہیں ہے! یہی فرق ہے پیغمبر اور غیر پیغمبر میں کہ سیاسی ذہن رکھنے والے جن واقعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، (خواہ وہ واقعات غیر اختیاری طریقے پر پیش آئے ہوں) پیغمبر دین کا نقصان کر کے ان سے فائدہ اٹھانا حرام، اور کفر کے مرادف سمجھتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اس امتحان میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی پورا اترا ہو، پیغمبروں کی جماعت میں بے شک اس کی مثال مل سکتی ہے، لیکن بانیانِ جماعت، اور سیاسی رہنماؤں کے

---

[1] یہ واقعہ سنہ ۱۰ھ کا ہے، حضرت ابراہیم کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی، جب ان کا انتقال ہوا۔

یہاں نہیں مل سکتی، آپ نے اس پر مستقل خطبہ دیا، اور فرمایا:۔

إن الشمس والقمر آيتان من آيات	سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے
الله لا ينخسفان لموت أحد	دو نشانیاں ہیں، ان کو کسی موت یا زندگی
ولا لحياته[1]۔	پر گرہن نہیں لگتا۔

گویا آپ نے فرمایا: تم نے کیا کہا؟ سورج اور چاند میں کسی کے مرنے اور کسی کے جینے پر کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا، یہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں، اور ان کا قانون دوسرا ہے، وہ اسی قانون کے پابند ہیں، ان پر کسی بڑی ہستی کے دنیا سے چلے جانے، یا کسی بڑی شخصیت سے تعلق رکھنے والے کسی واقعہ کا کوئی اثر نہیں پڑتا، اس موقعہ پر اگر آپ خاموشی اختیار فرماتے تو اس سے دنیا میں کوئی عظیم فساد پیدا ہونے والا نہیں تھا، بس ایک غلط خیال جو خوش عقیدگی، اور محبت و عظمت پر مبنی تھا، پیدا ہوا تھا، اور اضطراری طور پر پیدا ہوا تھا، اللہ کا رسول اس کو بھی برداشت نہ کر سکا، اور کہا کہ نہیں نہیں! میرے خاندان یا میری اولاد سے اس واقعہ کا کوئی تعلق نہیں، کائنات اس سے زیادہ وسیع، اور اللہ کی ذات اس سے غنی ہے، اللہ کا قانون ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے، یہ ایک اصولی رہنمائی تھی، جو پوری نسل انسانی، بلکہ ذہن انسانی کو دی گئی، ذہن انسانی نسل انسانی سے بھی زیادہ قیمتی، اور قابل لحاظ ہے، وہ ساری نسل انسانی پر حکومت کرتا ہے، نسل انسانی ذہن انسانی پر حکومت نہیں کرتی، یہ ذہن انسانی کا

[1] کتاب الکسوف، صحیح مسلم ج ا ص ۲۹۶

انحراف تھا جو بہت خطرناک ہے، اور اس کا علاج اور سدباب ضروری تھا۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کوئی صدی اپنی جگہ پر نہ مبارک کہی جا سکتی ہے نہ منحوس، میں گلاس کی مثال دوں گا، گلاس اگر خالی ہے، تو آپ اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ گلاس اچھا ہے یا برا ہے؟ اس کا انحصار اس "مظروف" پر ہے، جس کا یہ گلاس ظرف ہے، یہ پانی کا گلاس ہے، خدانخواستہ اگر شراب ہوتی، تو یہ شراب کا جام ہوتا، اگر اس کے اندر زہر بھرا ہوتا تو یہ زہر کا پیالہ ہوتا، یہ گلاس اپنی جگہ پر ایک معصوم، ایک بالکل غیر جانب دار چیز ہے، آپ پر منحصر ہے کہ آپ اس کو کس چیز سے بھرتے ہیں؟ آپ اس کو زمزم سے بھرتے ہیں تو یہ زمزم کا گلاس ہے، اگر خدانخواستہ اسے شراب سے بھرتے ہیں تو یہ شراب کا پیمانہ ہے، اس لئے نسل انسانی کے حق میں یہ صدی کیا ثابت ہوگی، مبارک ہوگی، یا منحوس ہوگی؟ اس کا سراسر انحصار ہماری اور آپ کی اور امت کی سعی پر ہے، جس کو خدا نے اپنے آخری پیغام کا حامل بنایا ہے۔

اس سلسلہ میں میں تین مثالیں دوں گا، دو مثالیں ان صدیوں کی جن کا آغاز نہایت ہولناک، مایوس کن، ہمت شکن، اور حوصلہ فرسا واقعات سے ہوا، اس وقت کے مؤرخوں اور اہل نظر نے اس صدی کا استقبال ناگواری سے نہیں، بلکہ جگر کے زخموں، دل کے داغوں، اور آنکھوں کے بہتے ہوئے آنسوؤں سے کیا، ابن اثیر، و ابن کثیر کی شہادت موجود ہے کہ اسلامی حلقوں نے ساتویں صدی کا استقبال کس طرح کیا؟ تمام آثار و قرائن بتا رہے تھے کہ یہ صدی مسلمانوں کے حق میں نہیں، ملت اسلامیہ کے

حق میں نہیں، اسلام کے حق میں نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے حق میں منحوس ترین صدی ثابت ہوگی، اس کا آغاز ایسے غیر معمولی واقعہ سے ہوا تھا جس طرح کا واقعہ (مؤرخ ابن اثیر (م ۶۳۵ھ) کے بقول) "اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا ایں دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا، تو وہ کچھ غلط نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا۔"[1]

میری مراد تاتاریوں کے اس حملہ سے ہے، جو ۶۱۶ھ میں اس وقت کی سب سے بڑی شہنشاہی (EMPIRE) علاء الدین خوارزم شاہ کی سلطنت پر ہوا، یہ ساتویں صدی ہجری کا آغاز تھا، اور تیرھویں صدی مسیحی چل رہی تھی، تاتاری مور و ملخ کی طرح اٹھے، اور عالم اسلام پر چھا گئے، ترکستان اور ایران کو زیر و زبر اور پورے پورے شہروں کو انھوں نے تاراج و بے چراغ بنا دیا، انسانی سروں اور لاشوں کے مینارے بنائے، جن پر چڑھ چڑھ کر انھوں نے صدا لگائی، پورے پورے شہر قبرستانوں میں تبدیل ہو گئے، اس واقعہ کی ہولناکی کا اندازہ آپ اس سے کیجئے کہ ایڈورڈ گبن نے اپنی کتاب "سقوط و زوال روما" (DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE) میں لکھا ہے کہ:۔

"سویڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی، ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ ان کے خوف سے اپنے معمول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلے۔"[2]

---

[1] الکامل لابن اثیر ج ۱۲ ص ۱۴۷-۱۴۸

[2] گبن ص ۱۶۰

خیال کیجئے کہ سویڈن کہاں واقع ہے؟ انگلستان کا ساحل اس علاقے سے جس پر تاتاریوں کی تاخت ہوئی تھی، جغرافی طور پر کتنی دور تھا، سویڈن کے ماہی گیر جن کا پیشہ ہی ماہی گیری تھا، کچھ عرصہ انگلستان کے ساحل پر شکار کھیلنے خوف و دہشت کے مارے نہیں آئے، کیمبرج کی "تاریخ عہد وسطیٰ" کے لکھنے والے کو اس واقعہ کی ہولناکی کی تصویر کھینچنے کے لئے اس سے بہتر الفاظ نہیں ملے کہ "آسمان نے زمین پر گر کر سب چیزوں کو مٹا دیا۔"[1]

یہ دونوں ان مغربی مصنفین کے بیانات ہیں، جو جذبات اور گرد و پیش کے حالات سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے، اور جن پر براہ راست تاتاری حملہ کی زد نہیں پڑی تھی، مسلمانوں نے اس واقعہ کو کس نظر سے دیکھا، اس کا اندازہ اس مشہور مقولہ اور کہاوت سے کیا جا سکتا ہے، جو اس زمانہ میں مسلمانوں کی زبان زد تھی۔

"اِذا قیل لك ان التتر انہزموا فلا تصدق" (ہر بات مان لینا لیکن جب یہ کہا جائے کہ کسی معرکہ میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس کو باور نہ کرنا) وہ مسلمان قوم جو اس کے مفہوم سے نا آشنا تھی، جس سے کہا گیا تھا:۔

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر۔ ۵۳) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

وہ مسلمان جنھوں نے قرآن مجید میں پڑھا تھا:۔

إِنَّهُ لَا يَايْئَسُ مِن رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ ... اللہ کی رحمت سے مایوس تو بس کافر ہی

---

[1] ماخوذ از "چنگیز خاں" از ہیرلڈ لیمب ص ۲۶۶

اَلْکٰفِرُوْنَ۔ (سورۂ یوسف ٨٧) لوگ ہوتے ہیں۔

اس وقت مسلمانوں پر ایسی مایوسی طاری تھی کہ ان کے لئے یہ کہاوت بن گئی تھی کہ ہر بات قابل تسلیم ہے، قرین قیاس ہے، کوئی بات دنیا میں ناممکن نہیں، ناممکن بات صرف یہ ہے کہ تاتاریوں نے کہیں شکست کھائی۔

علاء الدین خوارزم شاہ کی ایک غلطی سے تاتاری اپنے صدیوں کے "حصار" سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آپ تاریخ میں پڑھ سکتے ہیں، نشانہ مسلمان تھے، اور انھوں نے وہاں سے نکل کر پورے ترکستان، اور ایران وعراق کا تختہ الٹ دیا تھا، اور ان ملکوں کی حکومت، اور تہذیب وتمدن کا چراغ گل کردیا تھا، یہی وقت ہے، جب ذہین انسانوں کے قافلے تیزی کے ساتھ ہندوستان کی طرف آئے، اور ان کو یہاں پناہ ملی، یہ تیرھویں صدی عیسوی کا واقعہ ہے، آرنلڈ نے اپنی کتاب (PREACHING OF ISLAM) میں مسلمانوں کی مایوسی، اور شکستہ دلی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے، اس وقت ہر حساس آدمی جس کو خدا نے دیکھنے کے لئے دو آنکھیں دی تھیں، اور مقدمات واسباب سے نتائج نکالنے کی صلاحیت عطا کی تھی، پیشین گوئی کرسکتا تھا کہ اسلام کے دن پورے ہوچکے ہیں، مسلمانوں کا ستارۂ اقبال اب ہمیشہ کے لئے غروب ہو رہا ہے، اس عالمِ آشوب واقعہ سے مسلمانوں کو اصل نقصان پہونچا تھا، کیونکہ وہی اصل نشانہ تھے، اسی لئے سب سے زیادہ مسلمانوں کے لئے کام کرنے کا میدان تنگ تھا، اور سب سے کم امید ان کے لئے تھی، آرنلڈ لکھتا ہے:-

"(اسلام کے علاوہ) دو مذہب اور اس بات کی کوشش میں تھے کہ مغلوں اور تاتاریوں کو اپنا حلقہ بگوش بنائیں، وہ حالت بھی عجیب و غریب' اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہوگی جس وقت بودھ مذہب اور عیسائی مذہب' اور اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مغلوں کو جنھوں نے تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو پامال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔

اسلام کے لئے ایسے وقت میں بودھ مذہب' اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مغلوں کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی"[1]

سارے قرائن اس بات پر دلالت کرتے تھے کہ عیسائیت کو کامیابی ہوگی، اس لئے بھی کہ اس جنگ میں عیسائیت اصل فریق نہیں بنی تھی، اور دوسری مشکل یہ تھی کہ چنگیز خاں کے شہزادوں کے گھر میں عیسائی عورتیں تھیں' اور ان کے پادری ان کے درباروں میں تھے' اس لئے اگر قبول مذہب کا سوال ہوتا، تو حتمی طور پر یہ بات کہی جا سکتی تھی کہ وہ تنہا عیسائیت کو قبول کریں گے، لیکن آپ کو معلوم ہے کیا ہوا؟ آرنلڈ کو یہ الفاظ لکھنے پڑے کہ:۔

"بالآخر اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے اسلام اٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا مسلمان کر لیا"[2]

آرنلڈ مزید لکھتا ہے:۔

---

[1] دعوت اسلام صفحہ ۲۴۰-۲۴۱ [2] ایضاً صفحہ ۲۴۵-۲۴۶

"باوجود ان مشکلات کے، مغلوں اور وحشی قوموں نے جو بعد میں آئیں، انھیں مسلمانوں کا مذہب قبول کیا، جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندا تھا"[1]

وہ صدی جس کا آغاز نحوست سے ہوا تھا، (اگر نحوست کا کوئی لفظ اسلام کی ڈکشنری میں ہے) وہ صدی جس کا آغاز عالمگیر تاریکی اور عالمگیر مایوسی سے ہوا تھا، وہ صدی اسلام کی "فتح مبین" کی صدی بن گئی اور دنیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، بلکہ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں کہ وہ تاتاری جن کی تلواروں سے ابھی مسلمانوں کے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے، وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے، ہوورتھ لکھتا ہے کہ:۔

"مغلوں نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تماشے والے جو پردے پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں تو ایک تصویر میں سفید داڑھی کا ایک بڈھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مغلوں کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزار پہونچائے"[2]

لیکن دنیا نے یہ دیکھا کہ اس اسلام نے فاتح تاتاریوں کو فتح کر لیا۔

بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے سب کچھ کھو دیا تھا، خدا پر اعتماد نہیں کھویا تھا، ایمان و عقیدہ نہیں کھویا تھا، روحانی طاقت نہیں کھوئی تھی، شکست کس نے کھائی تھی؟ شکست کھائی تھی، (مجھے بہت تکلیف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے) نالائق مسلمان بادشاہوں نے، ایک کمزور و مریض معاشرہ نے، اسلام اپنی جگہ پر تھا، اسلام کے شیشہ پر کوئی بال بھی نہیں

---

[1] دعوت اسلام ص ۲۴۵-۲۴۶

[2] HOWORTH: HISTORY OF THE MONGOLS V.1 (LONDON 1876-80) P.159

پڑا تھا مسلمانوں نے اس وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ تاتاریوں کو تلوار سے زیر کرنا ممکن نہیں، اسلام کی تلوار کند ہو چکی ہے، تقریباً ٹوٹ چکی ہے، یا نیام میں جا چکی ہے، تاتاری یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ان کے پاس مسلمانوں سے بہتر فوجی طاقت ہے، وہ دولت و حکومت، اور تمدن و تہذیب کی خرابیوں اور بیماریوں سے دور ہیں، ان کے اندر مشقتوں اور دشواریوں کو برداشت کرنے کی وہ طاقت ہے، جو کبھی تازہ دم عربوں اور فاتحین اسلام میں تھی، وہ صدیوں کے بعد صحرا سے نکلے ہیں، ان کی ساری توانائی (ENERGY) ان کے اندر محفوظ ہے، ان کا مقابلہ تلوار سے نہیں کیا جاسکتا۔

آپ جانتے ہیں کہ پھر کس نے تاتاریوں کو فتح کیا؟ کس نے تاتاریوں کو اسلام کا کلمہ پڑھایا؟ اس نازک گھڑی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اہل دل سامنے آئے، جن کے اندر روحانی طاقت تھی، اور تقریباً نصف صدی کے اندر اندر انھوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنالیا، قبول اسلام کے واقعات پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں، افراد کے قبولِ اسلام کے، خاندانوں کے قبول اسلام کے، شہروں کے قبول اسلام کے، لیکن قوموں کے من حیث القوم قبول اسلام کی مثالیں ہمارے علم میں تین یا چار سے زیادہ نہیں، عربوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا، افغانوں نے من حیث القوم اسلام قبول کیا (افسوس ہے کہ وہ بھی آج ابتلاء و آزمائش میں ہیں) تاتاریوں اور ترکوں نے انفرادی طور پر نہیں من حیث القوم سو فیصدی اسلام قبول کیا، تاریخ کا یہ معمہ ہے، اور میں بھی اس آزمائش سے گذر چکا ہوں، یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ یہ تاریخ ساز اور ساری دنیا کے مستقبل پر اثر

ڈالنے والا واقعہ (تاتاریوں کے قبول اسلام کا واقعہ) پیش آئے، اور ہمیں ان لوگوں کے نام بھی نہ ملیں جن کے سر تاتاریوں کے قبول اسلام کا سہرا ہے، یہ کیا بات ہے؟

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار وہ واقعہ یاد آیا کہ جب مدائن کی فتح میں ایک مسلمان سپاہی کے ہاتھ کسریٰ کا تاج لگا، اور وہ اس کو اپنے دامن میں چھپا کر امیر افواج اسلامی سعد بن ابی وقاصؓ کے پاس لایا، جیسے کوئی چوری کا مال چھپا کر لاتا ہے "أیها الأمیر! یہ کوئی بہت قیمتی چیز معلوم ہوتی ہے، یہ میں آپ کے حوالہ کر رہا ہوں، تاکہ بیت المال میں داخل ہو جائے" پہلے تو مسلمان امیر نے جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، سپاہی کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اور حیرت کے دریا میں ڈوب گئے کہ اللہ اکبر! اتنا قیمتی جواہرات سے مرصع تاج زرّیں اور اس غریب سپاہی اور عرب کے بدو کی نیت خراب نہیں ہوئی، اس کو کسی وقت یہ خیال نہیں ہوا کہ بجائے یہاں لانے کے اس کو اپنے خیمہ میں لے جا کر رکھ دے، کہا کہ آپ کا نام؟ اس نے دروازہ کی طرف منہ کر کے اور پیٹھ پھیر کر کہا کہ "جس کے لئے میں نے یہ کام کیا ہے، وہ میرا نام جانتا ہے" اور یہ کہہ کر روانہ ہو گیا۔

یہ ایک فرد کا واقعہ ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تاتاریوں کو کلمہ پڑھانے والوں کا یہی طرز عمل تھا، انھوں نے اپنے نام کو چھپایا، مجھے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد جب میں اس موضوع پر لکھ رہا تھا، دو آدمیوں کے نام ملے ہیں، ایک درویش صفت وزیر امیر توزون کا نام[1] جو عراق پر حکومت کرنے والی تاتاری نسل کے بادشاہ کے وزیر اعظم تھے، وہ صوفی منش،

---

[1] آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

اور عابد وزاہد وزیر تھے، اور ان کا عمل اس پر تھا کہ۔ ع

درویش صفت باش، وکلاہ تتری دار

تاتاری بادشاہ کے کان میں وہ اچھی بات ڈالتے رہے حتیٰ کہ بغداد والوں نے اچانک ایک دن یہ دیکھا کہ جمعہ کا مبارک دن ہے، اور تاتاری حکمراں سلطان غازان اور اس کے وزراء ہاتھ میں تسبیحیں لئے ہوئے مسجد کو جا رہے ہیں۔[1]

دوسرا کارنامہ شیخ جمال الدین کا ہے جن کے خلوص بے پایاں، سچی روحانیت، اور دلی دردمندی کی برکت سے تاتاریوں کی چغتائی شاخ میں جو بلاد متوسطہ میں (جس کا مرکز کاشغر تھا) اسلام پھیلا، اور پوری شاخ مسلمان ہوگئی، واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین کہیں جارہے تھے، ایرانی تاتاریوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے وقعت تھے، وہ ان کو طعنہ دیتے تھے اور چڑاتے تھے کہ ایرانی بھی کوئی آدمی ہوتے ہیں! اتفاق سے وہ ایرانی بھی تھے، یہ تغلق تیمور شہزادہ کے شکار کا دن تھا، جو چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا، اور اس کی تاج پوشی میں کچھ مہینے یا کچھ سال باقی تھے، شکار کے بہت سے توہمات ہوتے ہیں، اور یہ لوگ تو سخت وہم پرست تھے، شیخ جمال الدین کو دیکھا کہ وہ شکار گاہ میں داخل ہو گئے، فوراً سپاہی نے پکڑا اور مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے لایا، شہزادہ بڑا ہی مکدر ہوا، اس نے کہا کہ آج تو میرا سارا شکار غارت گیا، کس منحوس کی میں نے صورت دیکھ لی، یہ ایرانی کمبخت یہاں آ گیا، اس کا کتا پاس تھا، غصہ میں کہا کہ تم اچھے ہو کہ میرا یہ کتا اچھا ہے؟ خیال کیجئے

---

[1] البدایہ والنہایہ ۔ ج ۱۳ ص ۳۴۰

اور اس منظر کو سامنے لائیے، اور دیکھیے کہ خدا کے بندوں نے کس طرح کام کیا، ان کے چہرہ پر کوئی رنگ نہیں آیا، کوئی شکن پیشانی پر نمودار نہیں ہوئی، نہایت اطمینان کے ساتھ کہا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا! شہزادہ نے کہا کیا مطلب؟ یہ کون سی مشکل بات ہے؟ انھوں نے کہا کہ اس کا انحصار کسی اور چیز پر ہے، اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو میں اچھا ہوں، ورنہ یہ کتا اچھا ہے۔

تغلق تیمور کے پتھر دل پر ضرب لگی محض کچھ کہہ دینے سے ایسی ضرب نہیں لگتی لیکن ع

ہر چہ از دل می خیزد، بر دل می ریزد

جو چیز دل سے اٹھتی ہے دل پر گرتی ہے، انھوں نے جس وقت یہ جملہ کہا ہوگا، اس کے ساتھ کتنی دعائیں، کتنے آنسو، کتنی آہیں رہی ہوں گی، خدایا! کہنے کو تو میں یہ جملہ کہتا ہوں اثر تو پیدا کر، یہ وقت ہے اسلام کی قسمت کے فیصلہ کا! اگر اس شخص کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو مسلمانوں کی قسمت بدل جاتی ہے، انھوں نے کہا کہ اس کا فیصلہ تو ابھی نہیں ہو سکتا، اس کا فیصلہ اس وقت ہوگا، جب میں کلمہ پڑھتا ہوا، اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں گا، اس وقت یقیناً میں اشرف المخلوقات ہوں، میں افضل ہوں، ورنہ یہ کتا ہزار درجہ مجھ سے بہتر رہے گا، یہ واقعہ جو فارسی تاریخوں سے ماخوذ ہے آرنلڈ کی کتاب PREACHING OF ISLAM میں کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔[۱]

---

[۱] آرنلڈ کی کتاب میں اس واقعہ پر شیخ کا جواب ان الفاظ میں نقل ہوا ہے، کہ اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے۔"

تغلق تیمور نے کہا کہ اچھا اس وقت تو میں کچھ نہیں کہتا، ولی عہد سلطنت ہوں آپ کہیں بھی ہوں، جب یہ سنیں کہ میری تاج پوشی ہوگئی تو مجھ سے ملئے گا، اب وہ اللہ کے بندے دن گننے لگے کہ وہ ساعت سعید کب آتی ہے کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو اور میں خدا کا پیغام اس تک پہونچاؤں، ان کی قسمت میں نہیں تھا، وقت اخیر آگیا، مرض موت میں انھوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا، اور کہا کہ بیٹا! ایک بہت بڑی سعادت تھی جو میری قسمت میں معلوم ہوتا ہے نہیں ہے، شاید تمہاری قسمت میں ہو، جس وقت تم یہ سننا کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوگئی، اس تک میرا سلام پہونچانا، اور کہنا کہ آپ نے میرے والد سے کچھ کہا تھا؟ چنانچہ وہ گئے، کون ان بیچاروں کو محل میں گھسنے دیتا؟ وہ تاتاری شہنشاہ کا محل تھا، دربانوں نے ان کو روک دیا، اس وقت تو انھوں نے انتظار کیا کہ کوئی موقعہ ملے، نہیں موقعہ ملا، ایک درخت کے نیچے مصلّٰی ڈال کر وہاں بیٹھ گئے، جب نماز کا وقت ہوتا اذان دیتے، اور نماز پڑھ لیتے، خدا کو منظور تھا، ایک دن صبح کے وقت جو میٹھی نیند کا وقت ہوتا ہے، انھوں نے اذان دی، وہ آواز محل اور خواب گاہ سلطانی میں پہونچی یا پہونچائی گئی، بادشاہ نے کہا، یہ کون باؤلا شخص ہے؟ کیا صدائے بے ہنگام لگاتا ہے یہ؟ میں نے تو آج تک یہ آواز نہیں سنی، محل کے قریب حفاظت (SECURITY) کے بڑے انتظامات ہوتے ہیں، داروغہ نے کہا کہ حضور! ایک دیوانہ سا آدمی آیا ہوا ہے، ہم نے بھی کوئی زیادہ تعرض نہیں کیا، کہ کوئی مسکین آدمی ہوگا صدا لگاتا ہے، بادشاہ نے حکم دیا، اسے پکڑ کر لاؤ، بلایا گیا، بادشاہ نے کہا، تم کون ہو؟ یہ کیا صدا

لگاتے ہو؟ اس کا کیا مطلب ہے؟

شیخ رشید الدین نے کہا کہ سرکار! آپ کو کچھ یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ شکار کھیلنے کے لئے نکلے تھے، ایک مسلمان فقیر آپ کے سامنے پیش کیا گیا تھا، آپ نے ان سے پوچھا تھا کہ تم اچھے ہو یا میرا کتا اچھا؟ انھوں نے جواب دیا تھا کہ اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہو سکتا' میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ اس کا فیصلہ ہو گیا، الحمدللہ وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔

بادشاہ نے سنا اور وزیر اعظم کو بلایا، کہا کہ ایک راز ہے جو میرے سینہ میں تھا، یہ واقعہ میرے ساتھ گذرا ہے، اس کا اثر آج تک میرے دل پر باقی ہے' میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا، تمہاری کیا رائے ہے؟ وزیر نے کہا کہ حضور والا! میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں' میں تو اپنے اسلام کو چھپا رہا تھا' میں ایک مرتبہ ایران گیا تھا، وہاں میں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اور وزراء بلائے گئے، اور جب بادشاہ کا منشاء معلوم ہوا تو سب مسلمان ہو گئے۔

ان بیچارے تاتاریوں کے پاس نہ تہذیب تھی' نہ علم و ادب' نہ کوئی آسمانی مذہب جس کو عقل قبول کرے' قانون بھی انھوں نے مسلمانوں ہی سے لیا تھا۔

وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ اللہ ہی کے لئے آسمان و زمین کے لشکر ہیں۔ (سورۂ فتح ۔ ۷)

یہ خدائی تدبیر تھی' اتنے متمدن اور ترقی یافتہ مملکت کا نظم و نسق کرنا تاتاریوں کے بس کا روگ نہ تھا، وہاں مسلمان قانون ساز موجود تھے، آب پاشی کا نظام، تحصیل وصول کا نظام، مقدمات کے فیصلے' ان کے پاس ایک مختصر و محدود قانون تعزیرات تھا، جو صحرائی محدود زندگی

اوراس کے تجربات پر مبنی تھا، پہلے سے وہ مسلمانوں کے دست نگر تھے، مسلمان دانشور، ماہرین قانون، اور علماء پہلے ہی اپنا کام کرچکے تھے، اور انھوں نے اتنی بڑی مملکت کے نظم ونسق میں ان کی مدد کی تھی، اور اسلام کی زندگی کی رہنمائی، اور معاشرہ ومملکت کی تنظیم کی صلاحیت کا نقش ان کے دماغوں پر قائم کردیا تھا، انھوں نے دیکھا کہ اب صرف عقیدہ اور ایمان کی بات باقی تھی، وہ مرحلہ یہاں طے ہوگیا۔

اسی وقت تغلق تیمور مسلمان ہوا، اور پورے ایران کے تاتاری چند دن میں مسلمان ہوگئے، ادھر امیر توزون کی کوشش سے عراق میں جو خاندان حکومت کررہا تھا، اسلام قبول کرچکا تھا جس طرح تسبیح کے دانے گرتے ہیں، تاتاری لاکھوں کی تعداد میں اسلام قبول کررہے تھے، یہ مسلمان دانشور مخلص علماء، واعظین، مبلغین، اور سب سے بڑھ کر اہل دل کا کارنامہ تھا، اس حقیقت میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں، پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان اہل دل نے اندر اندر کام کیا ہے، اور تاتاری ان کے نامۂ اعمال میں ہیں، یہ لاکھوں انسان (جنھوں نے تاریخ پر اثر ڈالا ہے) قیامت کے دن جب اٹھیں گے تو انھیں کے حساب میں شمار ہوں گے، ان اہل دل کا ذکر کرتے ہوئے اکبرالہ آبادی مرحوم کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آرہا ہے ؎

اچھے وہی ہیں آج، جو سوتے ہیں زیر گل
افسوس ہے، انھیں کے ہزاروں گلے ہوئے

میں نے ایک ایسی صدی کی مثال دی جس کا آغاز نہایت ہولناک حالات اور اسلام

کے حق میں پیام موت سے ہوا تھا لیکن مسلمانوں نے ہمت نہیں ہاری، انھوں نے سلطنت ہاری تھی، ہمت نہیں ہاری تھی، اور مسئلہ یہی ہے کہ سلطنت دس مرتبہ ہاری جائے گیارہویں مرتبہ آسکتی ہے، ہمت ایک مرتبہ ہار دی جائے تو اکثر واپس نہیں آتی داعیان اسلام بغیر کسی پروپیگنڈے کے خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے، مجھے علم نہیں کہ مسلمانوں نے اس وقت کوئی انجمن بنائی ہو کہ تاتاریوں کو مسلمان کرنا ہے، پہلے انھوں نے یہ اشتہار دیا ہو کہ تاتاری مسلمان ہوں گے تو یہ فائدہ ہوگا، اس سے کھوئی ہوئی سلطنت ملے گی، اقتدار قائم ہوگا، کچھ نہیں، خود مسلمانوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی کہ کیا ہو رہا ہے؟ اور اچانک یہ معلوم ہوا کہ پوری کی پوری قوم اسلام کی جھولی میں ڈال دی گئی۔

میں نے ایک مثال ساتویں صدی ہجری، اور تیرھویں صدی عیسوی کی دی جس کا آغاز ایسے مہیب، اور ایسے ہولناک حالات سے ہوا تھا جس سے مسلمانوں کے دل دہل گئے تھے، اور خدانخواستہ اگر ان میں عقیدہ کی طاقت نہ ہوتی، تو اگر ایمانی ارتداد نہیں تو تہذیبی اور ذہنی ارتداد تو ضرور آجاتا، اس وقت نہ تہذیبی ارتداد آیا نہ ذہنی ارتداد، اور ایمانی ارتداد کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔

دوسری مثال میں دسویں صدی ہجری (سولھویں صدی عیسوی) کی دوں گا، میں اس موقعہ پر عالم اسلام کی وسعتوں میں نہیں جاؤں گا، ہندوستان کا تذکرہ کرتا ہوں، دسویں صدی ہجری کا وسط اس حالت میں آیا کہ ہندوستان اسلام کی قیادت و رہنمائی

بلکہ اسلام کے برکات ہی سے محروم ہونے کے خطرہ سے دوچار ہوگیا تھا، بظاہر نظر آرہا
تھا کہ چند دنوں کا معاملہ ہے، تفصیلات آپ بڑی کتابوں میں پڑھئے[1]، اس وقت
عالم اسلام میں دو سب سے بڑی سلطنتیں تھیں، ایک عثمانیوں کی سلطنت ایشیائے کوچک
اور مشرق وسطی میں، دوسری مغلوں کی سلطنت اس تختی براعظم میں، اس کے بعد اگر
نمبر تھا تو ایران کی صفوی سلطنت کا، یہاں ہندوستان میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ
ایک قوی الارادہ، صاحب عزم، ذہین، فاتح اور کشورکشا سلطانِ وقت کے ساتھ
اس وقت کی نسل کے چند ذہین ترین علماء اور دانشور (جن میں ابوالفضل اور فیضی
کا نام سب سے نمایاں ہے) ایک تحریک میں شامل ہوگئے جس کا مقصد ہندوستان کا
رُخ اسلام سے ہٹاکر اکبر کے دین الٰہی، اور اس وحدت ادیان کی طرف موڑنا تھا،
جس میں پلڑا ہمیشہ دوسری طرف جھکا ہوا ہوتا تھا[2]۔

یہ مادّی طاقت اور ذہانت دونوں کا خطرناک سنگم تھا، یا اسلام کے خلاف مطلقُ
العنان سلطنت، اور بے قید اور آزاد عقلیت کی سازش تھی جس کی مثالیں تاریخ میں

---

[1] مثلاً تاریخ دعوت وعزیمت حصۂ چہارم

[2] اس رواداری اور صلح کل تحریک میں اسلام کے ساتھ مساویانہ و منصفانہ برتاؤ قائم نہیں رہ سکا، قدرۃً اس مذہب اور فرقہ کا پلڑا جھک گیا جس کا دربار میں رسوخ، اور بادشاہ کی طبیعت میں رجحان غالب تھا، "مختصر تاریخ ہند" کے مصنفین ___ ڈبلو۔ایچ مورلینڈ، اور اے۔سی چٹرجی۔ نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ "اکبری قوانین دین اسلام سے زیادہ ہندو مذہب کی موافقت اور حمایت میں ہوتے تھے۔" (ص۲۵۱)

کم ملتی ہیں، اس وقت اس بات کو برملا کہا جانے لگا تھا، کہ دسویں صدی ختم ہو رہی ہے گیارہویں صدی شروع ہونے والی ہے، کسی دین کے لئے ایک ہزار سال کی مدت بہت ہوتی ہے، ایران و ہندوستان کے بہت سے فاضلوں نے جن کو خوف خدا، اور دین کا گہرا علم نہیں تھا، اور جاہ واقتدار، اور منصب و عہدہ کی ہوس تھی، اس کے لئے مواد فراہم کر دیا کہ فلاں مذہب کا ستارۂ اقبال اتنے دنوں تک بلند رہا، ایک ہزار سال کے بعد دوسرا مذہب آیا، اور دوسری فکری رہنمائی اور قیادت میدان میں آئی، اب دینِ عربی کی عمر پوری ہو گئی ہے، اور رسول عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایک ہزار سال گذر گئے ہیں، اس نسل کو نئے دین و آئین کی ضرورت ہے، اکثر ایسے فتنے ان فلسفوں سے پیدا ہوتے ہیں، جو مذہب اور اخلاقیات کی رہنمائی سے آزاد ہوتے ہیں۔

اس خطرہ کا ذرا اندازہ کیجئے، اس تحریک کا علم بردار اور رمز (SYMBOL) وہ شخص تھا جس کی تلوار کی دھاک سارے ہندوستان پر بیٹھی ہوئی تھی جس نے ہر نا قابل تسخیر مہم کو سر کیا تھا، اور جو شکست و ناکامی کو جانتا نہیں تھا جس میں جوانی کا خون تھا، اور اپنے جدّ اعلیٰ تیمور کی حوصلہ مندی، اور بابر کی مشکل پسندی، ایک طرف وہ شہنشاہ ہے، اور دوسری طرف وہ ذہین ترین انسان ہیں، جن کی آج بھی آپ تحریریں پڑھیں تو ان کی ذہانت کا لوہا مان جائیں گے۔

پھر کیا ہوا؟ دسویں صدی کا آخر یہ خبر لے کر آیا کہ اسلام کے قدم اس ملک سے اکھڑ رہے ہیں، اب ہندوستان میں سیاسی اقتدار ہی نہیں، دینی اور روحانی اقتدار بھی دوسری

طاقتوں اور فلسفوں کی طرف منتقل ہو رہا ہے، یہ انقلاب ان فاتحین کی کوششوں پر پانی پھیر رہا تھا، جنھوں نے کئی صدی قبل اپنی جان کی بازی لگا کر اس ملک کو فتح کیا تھا اور دوسری طرف حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، اور ان کے پاک نہاد خلفاء کی کوششوں پر جنھوں نے اپنے اپنے گوشے میں بیٹھ کر سعید روحوں کو انسانیت اور محبت، مساواتِ انسانی اور عدلِ اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا درس دیا تھا، باہر رہ کر حکومت وقت کی دینی و اخلاقی نگرانی کی تھی، اور حکومت و معاشرہ کو صالح، قوی، اور امانت دار، خدا ترس، انسانیت دوست افراد مہیا کئے تھے، اور ملک کی علمی و تعلیمی تحریک میں بھی نئی روح پھونک دی تھی[1]۔

پھر کیا ہوا؟ مجھے کہنا پڑتا ہے کہ سیاسی افق سے نہیں، کسی مادی افق سے نہیں، صرف اسی ایمان و روحانیت کے گوشہ سے، اسی اخلاص و للّٰہیت کے گوشہ سے، اسی علم و حکمت کے گوشہ سے جو ہمیشہ اپنا کام کرتا رہا ہے، اور جس نے گرتوں کو سنبھالا ہے، ایک ستارہ طلوع ہوتا ہے، جس کا نام شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانیؒ (۹۷۱-۱۰۳۴ھ) ہے، جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے ؎

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے　　جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

[1] اس اجمال کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق احمد نظامی، اور "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" از مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ۔

اسلام کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لئے جس میں اس وقت کے ذہین ترین انسان شریک تھے، ایک فقیر بے نوا سرہند کے گوشہ میں بیٹھ کر یہ عزم کرتا ہے کہ یہ نہیں ہونا ہے، انھوں نے کہا کہ مسلمان اس ملک میں باعزت و آزاد طریقہ پر رہنے، اور اپنے دینی شعائر کو باقی رکھنے کے حق سے کیوں محروم کئے جاتے ہیں، اور صرف انھیں پر زندگی کا میدان کیوں تنگ کیا جا رہا ہے۔؟

پھر کیا نتیجہ ہوا؟ گیارھویں صدی جب شروع ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ رنگ بالکل بدل گیا ہے اس کے بعد سے تین صدیوں تک کے لئے اسلام کا مستقبل اس ملک میں بالکل محفوظ کر دیا گیا، اس وقت اللہ کا یہ بندہ سرہند میں بیٹھ گیا، نبوت و رسالت محمدی کی ضرورت و بقا اور شریعت و سنت کے مقام و دوام کے خلاف جو علمی و اشراقی مغالطے تھے، ان کا پردہ چاک کیا، اور اس پر اعتماد بحال کیا[۱]، دوسری طرف اس خطرہ کا سدّ باب جو تیزی سے بڑھ رہا تھا، اس کی (STRATEGY) حکمت عملی کیا تھی؟ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں، اکبر کے خلاف کسی طاقت کو منظم کرنے کی کوشش نہیں، اس کے تاریخی مطالعہ نے بھی، اور اس کی قرآنی بصیرت نے بھی اس کو بتایا کہ اگر حریف بن کر سامنے آؤ گے تو کچل دیئے جاؤ گے، تمہیں کام کرنے کا کوئی وقت نہیں ملے گا، اللہ سے دعائیں کرو، اپنے گرد مخلص اور لائق افراد کو اکٹھا کرو، ان کی ہمہ گیر تربیت کرو، وہ دولت اور حکومت کے دریا سے گذر جائیں، لیکن ان کا دامن بھی تر نہ ہو، وہ جاہ و حشمت

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تاریخ دعوت و عزیمت حصہ چہارم" باب پنجم

کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں، جو مسلمان امراء دربار جہانگیری میں اعلیٰ عہدوں اور ذمہ داریوں پر فائز ہیں، ان کے دلوں کو چھوؤ، ان کو لکھو کہ "ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام اس وقت موت و زندگی کے آخری مرحلہ سے گذر رہا ہے، آپ کو کچھ کرنا چاہیئے، جارحانہ طریقہ سے نہیں، بالکل تعمیری علمی اور فکری طور پر، اور دل کے اعتقاد اور یقین کے ساتھ"۔

مجدد صاحب نے خط و کتابت شروع کی، ان لوگوں کے ناموں کی فہرست طویل ہے، جن سے انھوں نے مراسلت کی، ان میں عبدالرحیم خان خاناں، اور نواب مرتضیٰ خاں (سید فرید) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، نتیجہ کیا ہوا؟ ۱۵-۲۰ برس کے عرصہ میں ماحول بدل گیا، ہندوستانی مسلمان صرف ہندوستان کے لئے نہیں، پورے عالم اسلام کے لئے مرجع و مرکز بن گئے، روحانیت میں، علم حدیث اور عربی لغت تک میں (جو خالص عرب ملکوں کی چیز تھی) یہ اسی برگزیدہ شخصیت کی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس کی وجہ سے ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی، اور علوم دینیہ کے بلند پایہ ماہر و محقق پیدا ہوئے، پھر چراغ سے چراغ جلا اور کچھ عرصہ کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ (۱۱۱۴-۱۱۷۶ھ) کی شخصیت سامنے آئی، جنھوں نے ایک نیا "علم کلام" پیدا کیا، نظامِ خلافت کی ایسی تشریح و تفصیل، اور صحیح اسلامی حکومت کا خاکہ پیش کیا جو علمی طور پر اس سے پہلے شاید پیش نہیں کیا گیا تھا، اسی کے ساتھ انھوں نے ہندوستان کی گرتی ہوئی مسلم حکومت کو (جس کا بدل اس وقت موجود نہیں تھا) سہارا دینے اور اس کے جسم میں نیا خون پہونچانے کی کوشش کی کہ اس کی

شکست و ریخت سے ہندوستان میں سخت سیاسی و اخلاقی انتشار کا خطرہ تھا۔[۱]

ان کے باکمال اور باتوفیق فرزندوں نے (جن میں حضرت شاہ عبدالعزیز پیش پیش تھے) اس ملک میں کتاب و سنت کا علم عام کیا، قرآن مجید کے مطالعہ اور فہم کا ذوق پیدا کیا، حدیث کی اشاعت کی، اور عقائد، اعمال و رسوم کی اصلاح کا عظیم الشان کام انجام دیا۔

اسی سلسلۂ طلائی کی ایک زریں، اور مستحکم کڑی، اصلاح و جہاد، احیائے سنت واحیائے خلافت کی وہ عظیم الشان تحریک تھی جو حضرت سید احمد شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ (۱۲۴۶ھ) کی قیادت میں اس برعظیم میں شروع ہوئی اور جس نے انقلاب حال، اسلامی سیرت، دینی حمیت، اور آدم گری، اور مردم سازی کے وہ نمونے پیش کئے جنھوں نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کردی، اس جماعت نے دعوت و اصلاح کے اتنے وسیع اور طویل محاذ پر اپنی جدوجہد جاری رکھی جس کی نظیر عالم اسلام کی پچھلی تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔[۲]

پھر عظیم دینی مدارس کا دور آیا، اور دارالعلوم دیوبند، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور وہ دوسرے مدارس جا بجا قائم ہوئے، جن کی بنیاد

۱؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے سیاسی مکتوبات" مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی

۲؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم، اور "تحقیق و انصاف کی عدالت میں ایک مظلوم مصلح کا مقدمہ" از ابوالحسن علی ندوی۔

خالص کتاب و سنت کی تعلیم و اشاعت پر تھی[1]، ان مدارس کے عالی مرتبہ بانیوں، اور مخلص و راسخ العلم فضلاء کی مساعی جمیلہ سے بڑے پیمانہ پر عقائد و اعمال کی اصلاح ہوئی، دینی ذوق اور اسلامی حمیت پیدا ہوئی، ان میں سے ایک بڑی تعداد نے آزادی کی تحریک، اور ملک کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا، اور ان کی وجہ سے (بعض دوسرے اسلامی ملکوں کی طرح) مذہب و سیاست کی تفریق کا اصول کامیاب نہیں ہونے پایا، اور ملک کے عوام، اور تعلیم یافتہ طبقہ علماء و اہل دین کی قیادت سے (باغی ہونے کا کیا ذکر) ان کی رہنمائی و اثرات سے بھی آزاد اور مستغنی نہیں ہو سکے۔

ان علماء کی علمی کاوشوں کی بدولت ہندوستان کو وہ دینی مرکزیت حاصل ہوئی کہ اگر یمن میں، مراکش میں، کسی شخص کو علم حدیث میں کمال پیدا کرنا مقصود ہوتا تو سیدھا ہندوستان آتا، اسی طرح اگر کسی کو روحانی پیاس بجھانے کا شوق ہوتا، اور وہ تزکیۂ نفس اور روحانی ترقی کے مدارج طے کرنا چاہتا تو ہندوستان کا رخ کرتا، مولانا خالد رومی پیدا ہوتے ہیں عراق اور شام کے شمالی حصہ میں جو ترکی میں داخل ہے، ساری تعلیم و تربیت ان کی شہر زور اور دمشق کی ہے لیکن جب ان کو اپنی روح کی پیاس بجھانے اور اللہ کی باتوں پر غیبی حقائق پر وہ یقین پیدا کرنے کا شوق پیدا ہوا، جو بدیہیات اور ریاضی کے نتائج پر ہوتا ہے، تو وہ کہاں گئے؟ وہ اپنے وطن شہر زور سے سیدھے دہلی شاہ غلام علی صاحب (م ۱۲۴۰ھ) کی خانقاہ میں آئے، اور وہاں آکر پڑ گئے، اور یہاں سے کامیاب

[1] ان کے تفصیلی تعارف کے لئے راقم کی کتاب "ہندوستانی مسلمان ایک تاریخی جائزہ" ملاحظہ ہو۔

ہو گرگئے، اور عراق اور شام اور ترکی کے ملکوں میں انھوں نے اخلاق و روحانیت، اور معارف و حقائق کے دریا بہا دیئے، اور ایک نئی روح پھونک دی جس کے اثرات ابھی تک موجود ہیں۔

اگرچہ یہ گفتگو ہندوستان کی اصلاحی و تجدیدی تحریکوں تک محدود تھی، لیکن اس میں بیرون ہند، بلکہ مرکز اسلام (جزیرۃ العرب) کی عظیم تحریک تطہیر عقائد، اور دعوت دین خالص کا ذکر کرنا ضروری ہے، یہ شیخ محمد بن عبدالوہاب (۱۱۱۵ھ - ۱۲۰۶ھ) کی دعوت تھی، جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے معاصر ہیں[۱]، اس تحریک نے بعض خاص تاریخی و سیاسی اسباب کی بناء پر وہ کامیابی حاصل کی، جو کم مصلحین اور داعیوں کے حصے میں آئی تھی، اس کے نتیجہ میں ایک پوری نسل، ایک وسیع سلطنت، اور ایک مکتب فکر پیدا ہوا جس کے اثرات دور دور پھیلے، اسی زمانہ میں یمن میں علامہ محمد بن علی الشوکانی (۱۱۷۲ - ۱۲۵۰ھ) عسیر میں احمد بن عبداللہ بن ادریس حسنی بانی سلسلۂ ادریسیہ، اور لیبیا میں سید محمد بن علی السنوسی (۱۲۰۶ - ۱۲۷۶ھ) پیدا ہوئے[۲]، جنھوں نے اپنے اپنے مقامات پر اصلاح عقائد و رسوم،

---

[۱] شیخ محمد بن عبدالوہاب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے تقریباً ہم عمر ہیں، شاہ صاحب کی ولادت ۱۱۱۴ھ کی ہے، اور شیخ کی ولادت ۱۱۱۵ھ کی، شیخ کے تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ ہو "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم و بدنام مصلح" از مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔ [۲] مشہور مجاہد و مصلح سیدی احمد الشریف السنوسی (م ۱۳۵۱ھ) انھیں محمد بن علی السنوسی کے پوتے تھے، جنھوں نے طرابلس اور برقہ کی جنگ میں اطالیوں کے چھکے چھڑا دیئے، اور تیرہ ۱۳ برس تک محض اپنے تربیت یافتہ رفقاء اور تلامذہ کی مدد سے یورپ کی (باقی ص ۳۵ پر)

اشاعت کتاب وسنت، اور مجاہدانہ تربیت وسیرت سازی کا عظیم کام انجام دیا، مغربی مستشرقین ان سب مصلحین کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت وتحریک کا خوشہ چیں اور ان کا بلاواسطہ یا بالواسطہ شاگرد ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن اس کا ثبوت مشکل ہے مغربی ذہن اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ قرآن وحدیث کا مخلصانہ مطالعہ ہر دور میں ایسی اصلاحی شخصیتیں پیدا کرتا رہا ہے، جو بگڑے ہوئے حالات، اور فاسد خیالات سے نبرد آزما ہیں، اور اس کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا، اسی کے کچھ بعد علامہ سید جمال الدین افغانی (متوفی ۱۳۱۴ھ - ۱۸۹۷ء) نے اسلامی حمیت، اور اتحاد عالم اسلامی کا صور پھونکا جس سے مصر وشام اور ترکی کے دشت وجبل اور بام و در گونج اٹھے، انھوں نے اور ان کے شاگرد رشید مفتی محمد عبدہ مصری (م ۱۳۲۳ھ - ۱۹۰۵ء) نے اپنے عہد کی ذہین اور بے چین نوجوان مسلمان نسل میں ذہنی بیداری پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا۔[1]

(باقی صہ۳ کا) اس بڑی طاقت کا کامیابی سے مقابلہ کرتے رہے، وہ سیف وتسبیح، اور قرآن وشمشیر کے بیک وقت حامل تھے، اور ان کا شمار اپنے وقت کے شیوخ کبار، اور اہل اللہ میں سے تھا، ۱۳۵۱ھ (۱۹۳۳ء) میں مدینہ منورہ میں وفات پائی، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "حاضر العالم الاسلامی" از امیر شکیب ارسلان۔ ج ۲۔

[1] پچھلے چند برسوں سے دونوں (استاد وشاگرد) کی شخصیتیں تنقید وتحقیق کا موضوع بن گئی ہیں، اور ان کے خلاف عربی رسائل اور علمی مجالس میں مضامین اور خطبات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جن کی وجہ سے ان دونوں کی شخصیتوں کی عظمت اتنی مسلّم نہیں رہی...... جتنی ربع صدی پہلے تھی، لیکن یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ پر ہے کہ ان دونوں نے نوجوانوں کا اسلام کی صلاحیت اور عقلیت پر اعتماد بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "مسلم ممالک میں اسلامیت و مغربیت کی کشمکش"

جہاں تک چودھویں صدی ہجری کا تعلق ہے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے وہ کامیابیوں، اور ناکامیوں، غلطیوں اور تلافی کی کوششوں، مسلمان قوموں کی فریب خوردگی اور سادہ لوحی، اور اسی کے ساتھ سیاسی شعور اور بیداری، کثیر التعداد آزاد مسلم ریاستوں اور حکومتوں کے قیام، اور اسی کے ساتھ متعدد طاقتور اسلامی تحریکوں کی صدی ہے، اس صدی میں واقعات وحوادث کا جو تنوع اور تضاد نظر آتا ہے، اس کی مثال پچھلی صدیوں میں ملنی مشکل ہے۔

اس صدی کا آغاز ہوا تو سلطنت عثمانیہ اپنی پوری وسعت، اور کروفر کے ساتھ موجود تھی، اور مسلمانوں کے سروں پر خلافت اسلامی کا علم سایہ فگن تھا، مسند خلافت پر سلطان عبدالحمید خان ثانی (۱۲۹۱ھ - ۱۳۲۷ھ / ۱۸۷۶ء - ۱۹۰۹ء) متمکن تھے، جن کی ذات بیسویں صدی کے وسط تک سخت تنقید واعتراض کا نشانہ بنی رہی ہے، اور مغربی مصنفین نے تو اپنے قلم کی ساری سیاہی ان کے چہرہ کو بدنما اور تاریک دکھانے میں صرف کر دی، لیکن پچھلے برسوں میں ان کے متعلق جو تحقیقی مضامین مؤقر عربی و ترکی رسائل میں شائع ہوئے ہیں، نیز ان کے روزنامچے کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ وہ (اپنی بعض مزاجی خصوصیات اور کمزوریوں کے باوجود، موروثی سلطنت کا بھی خاصہ ہو سکتی ہیں، اور اندرونی و بیرونی مخالفتوں اور ان کے گرد پھیلی ہوئی سازشوں کا ردعمل بھی) ایک نہایت باحمیت، اور صاحب غیرت مسلمان حکمراں تھے، جن کے عہد میں مغربی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کرنے، اور یہودی فلسطین کے کسی حصہ پر بھی قابض ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے، اور جنھوں نے ممتاز یہودی وفد کی ساری پیش کشوں اور رشوتوں کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا،

اور زمین سے مٹی کی مٹھی اٹھا کر کہا تھا کہ "بیت المقدس تو بڑی چیز ہے، میں فلسطین کی سرزمین کی اتنی خاک بھی دینے کے لئے تیار نہیں"[1] اور جنھوں نے خلافت اسلامی کے پیکر میں ایک نئی روح، اور عالم اسلام میں وحدت اسلامی، اور "جامعہ اسلامیہ" کا ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا تھا:

دولت عثمانیہ جو تولیت حرمین شریفین کے شرف، اور خلافت اسلامیہ کے اعزاز سے مفتخر تھی، اپنی ساری کمزوریوں، اور داخلی و خارجی فتنوں، اور مہیب سازشوں کے باوجود ملت اسلامیہ کے لئے خواہ وہ کہیں بستی ہو، قوت و عزت کا سرچشمہ، اور مقامات مقدسہ اور ممالک عربیہ کے لئے ایک آہنی حصار تھی جس کی موجودگی میں یہ مقامات و ممالک (جن سے مسلمانوں کی عزت و قسمت وابستہ تھی اور ہے) لاوارث آدمی کے مال کی طرح تقسیم نہیں کئے جا سکتے تھے، اس صدی کی ابتدا میں دولت عثمانیہ مشرق میں یمن وعسیر سے لے کر مغرب میں ایک طرف یورپ میں ادرنہ والبانیہ، افریقہ میں طرابلس، تونس قزان تک، دوسری طرف جنوب میں اسوان، مصر، برقہ سے لے کر شمال میں بلگیریا، ریاست ہائے بلقان، طرابزون، اور ایڈریانوپل تک وسیع تھی، دولت عثمانیہ کے حدود میں ایشیائے کوچک کا اکثر حصہ شام (جس میں موجودہ فلسطین، لبنان اور شرق اردن بھی شامل تھے) مصر، جزیرۃ العرب، عراق، جزیرۂ قبرص شامل تھا،

[1] یہ روایت میں نے مفتی سید امین الحسینی صاحب مرحوم کی زبان سے کئی بار سنی، جو اس سلسلہ کے ایک معتبر راوی، اور ثقہ گواہ تھے۔

اور یورپ پر بھی اس "مرد بیمار"[1] کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

لیکن مسلمانوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی (جو خلافت، اور ایک وسیع مسلم امپائر کی شکل میں ان کو خدا نے دی تھی) سلطان عبدالحمید خاں کی ۱۹۰۹ء میں معزولی تو ایسا المناک واقعہ نہ تھا جس سے تاریخ بدل جائے، وہ اس وقت کے سیاسی حالات یا سلطان کے خلاف سازشوں، اور ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے، ان کے بعد علی الترتیب سلطان رشاد، سلطان وحیدالدین خاں اور سلطان عبدالمجید تخت سلطنت، اور خلافت پر متمکن ہوئے، لیکن اصل المناک واقعہ جس سے پورے عالم اسلام کو ذلت و نکبت کا سامنا کرنا پڑا، اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو بیت المقدس سے ہاتھ دھونا پڑا اور بقول مولانا شبلی کے "حرم کے سمت بھی صید افگنوں کی نگاہیں اٹھیں" ممالک عربیہ مصر و شام (عظیم) عراق اور افریقہ کی پوری شمالی پٹی براہ راست یا بالواسطہ مغربی اقوام و ممالک کے زیر حکومت یا زیر انتداب آئے، اور جس کی سزا کی میعاد (جہاں تک مغربی ایشیاء کے عرب ممالک کا تعلق ہے) ابھی ختم نہیں ہوئی، ترکوں کے خلاف وہ اقدام تھا، جو عربوں نے اپنے ممالک کی چالاک عیسائی اقلیت کی سازش کا شکار، اور اتحادیوں کے پر فریب وعدوں پر اعتبار، اور قومیت عربیہ کے سحر سامری سے مسحور ہو کر پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے موقعہ پر کیا، اور جس کے قائد شریف مکہ شریف حسین تھے

---

[1] یورپ کے مصنفین اور اہل سیاست ترکی سلطنت اور قوم کو مرد بیمار (SICK MAN) کے نام سے یاد کرتے تھے

جنھوں نے ۱۰ر جون ۱۹۱۶ء کو ترکوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس کے نتیجہ میں ۱۹۱۷ء میں شام و فلسطین ترکوں سے آزاد ہوئے، مصر، برطانوی اقتدار میں چلا گیا، ۹ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو بیت المقدس پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، یکم اکتوبر ۱۹۱۸ء کو شریف حسین کے فرزند امیر فیصل اور جنرل النبی دمشق میں فاتحانہ داخل ہوئے، فرنچ جنرل گورو نے فاتح بیت المقدس، اور آبروئے اسلام سلطان صلاح الدین ایوبی کی قبر کو پاؤں سے ٹھوکر ماری اور کہا کہ "لو صلاح الدین ہم یہاں تک آگئے اور ہم نے شام فتح کرلیا، تم کب تک سوتے رہوگے"؟ اکتوبر ۱۹۱۸ء کے آخر تک حجاز، شام، لبنان اور عراق و عرب کے تمام علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے تسلط میں آچکے تھے۔

سارا عالم اسلام اس صورت حال سے بے چین تھا، اور مسلمان ذلیل، لیکن سب سے زیادہ ہندوستانی مسلمانوں نے اس پر بے چینی محسوس کی، اور اپنے قلبی و ذہنی اضطراب کا مظاہرہ کیا، یہی زمانہ ہے، جب تحریک خلافت نے (جو اس صدی کی سب سے بڑی نیم دینی نیم سیاسی تحریک تھی) مسلمان علماء و قائدین مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی قیادت میں (جو اپنی طاقتور شخصیت، اسلامی حمیت اور جوش خطابت میں عالم اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے) سارے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اس موقعہ پر مسلمانوں کا دل ناسور کی طرح بہا، اور ملی احساس کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹا، اس زلزلہ انگیز تحریک سے نہ صرف مسلمانوں میں، بلکہ پورے

ملک میں سیاسی شعور، اور مغربی اقتدار اور تہذیب سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا، خود گاندھی جی جیسے عظیم ملکی قائد نے اس تحریک کا ساتھ دیا، اور اس کے قائدین کے ساتھ ملک گیر دورے کئے۔

لیکن جب ۳ / مارچ ۱۹۲۴ء کو مصطفےٰ کمال پاشا (کمال آتا ترک) نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کیا، تو ہندوستانی مسلمانوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی، اور ان کو دنیا تیرۂ و تار نظر آنے لگی، اقبالؔ نے اسی موقع پر کہا تھا ؎

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

یہ زمانہ پورے عالم اسلام کے لئے روح فرسا، اور ہوش ربا تھا، اور ایک طرح سے اس کو ساتویں صدی ہجری کے اس نصف اول سے مماثلت تھی جس میں نیم وحشی تاتاریوں نے عالم اسلام کے زرخیز و مردم خیز متمدن، اور مرکزی ممالک پر حملہ، اور پھر قبضہ کر کے اسلامی اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا، اور مسلمانوں کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا تھا، لیکن وہ محض ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی جس کی متمدن، و تن آسان اسلامی دنیا تاب نہ لا سکی، اس کے ساتھ کوئی فکری فلسفہ، کوئی تازہ دم تہذیب، اور نئے افکار و اقدار نہ تھے، لیکن مغربی قوموں اور ملکوں کی اس تاخت کی جو چودھویں صدی کے پہلے ثلث، اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی، نوعیت بالکل جدا تھی، اس کے ساتھ نئے فلسفے، نیا نظام تعلیم، نئے افکار و اقدار، الحاد و تشکیک کا نیا لشکر،

اور مادیت و مادہ پرستی کا نیا مذہب تھا۔

سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۹۱۷ء میں بالشویک انقلاب پیش آیا، جو صرف تاریخ، جغرافیہ، اور سیاسی نقشہ کو ہی تبدیل کرنے والا نہ تھا، اور وہ اقتصادیات وسیاسیات ہی کے حدود میں محدود نہ تھا، عقیدہ و عمل، اصول و مبادی، اخلاق ومعاشرت، بلکہ حیات انسانی اور شعور انسانی کی بنیادوں کو منہدم کرنے والا، اور ان کے ملبہ پر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے والا تھا، اس کی زد سب سے زیادہ اسلام اور مسلمانوں پر پڑنے والی تھی، جو ایک ثبت، متعین اور مختتم دین کے پیرو اور داعی تھے، اور جن کے دین کی حقیقت، اور فرائض میں "احتساب کائنات" کا فریضہ بھی شامل تھا، مگر افسوس ہے کہ ان میں بر وقت اس خطرہ کو محسوس کرنے والے اور اس کا مقابلہ کرنے والے بہت کم تھے، اور انھوں نے اس معاملہ میں اس "فراستِ مؤمن" کا ثبوت نہیں دیا، جو اس سے پہلے اس سے کم درجہ کے خطرات کو بھانپ لیتی تھی، مغربی عالم اسلام میں ترکی کے سابق وزیر حربیہ، اور مومن مجاہد غازی انور پاشا مرحوم نے بالشویکی خطرہ کو صحیح طور پر محسوس کیا، انھوں نے ترکستان کے باشندوں کو منظم کرکے کمیونسٹوں کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا، ۱۹۲۱ء ۱۹۲۲ء میں ان کے اور بالشویکوں کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں، ۴ر اگست ۱۹۲۲ء کو چکن نامی گاؤں کے قریب انھوں نے ایک روسی فوج پر حملہ کیا، غنیم کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس جنگ میں انور پاشا شہید ہوئے، یہ جمعہ کا دن تھا، اور ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ

کی غالباً ساتویں تاریخ۔[1]

اسی انقلاب سے نہ صرف یہ کہ وسط ایشیا کی خالص مسلم آبادی کے مردم خیز و تاریخ ساز ممالک، روسی وچینی ترکستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اور وہاں کی موجودہ، اور آئندہ نسلوں کو نہ صرف ذہنی وتہذیبی ارتداد، بلکہ اعتقادی وایمانی ارتداد کے خطرے سے دوچار کر دیا، اور وہاں اسپین کی وہ تاریخ دہرائی جانے لگی جو نویں صدی ہجری میں پیش آئی تھی، بلکہ صرف اس تحتی براعظم کو نہیں ممالک عربیہ و مرکز اسلام کو بھی اس تحریک سے متاثر ہونے کے خطرے سے دوچار اور اس کا حلیف یا حریف بننے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا، اور نوبت یہاں تک آئی کہ بعض عرب ممالک نے[2] اس سے صرف اسلحہ، جدید مصنوعات ہی درآمد نہیں کیں، اس کی آئیڈیالوجی، اور اس کا فلسفہ بھی درآمد کیا، اور اس کے پرجوش حامی اور داعی بن گئے، اور اب ماضی قریب میں اس افغانستان پر بھی اس کا فوجی تسلط ہو گیا، جو اسلامی شجاعت اور حمیت کا معدن ومخزن تھا، اور جس نے ہندوستان کو ہر دور میں لائق منتظم، حاکم و قائد اور عالم و درویش مہیا کئے تھے، اور جو اس کی آزادی کا پاسبان اور اس کا بیرونی قلعہ تھا، اور اس طرح یہ فتنۂ عالم آشوب برصغیر کے دروازہ پر پہونچ گیا۔

---

[1] انور پاشا کے اسلامی جذبات اور ان عظیم قدمات کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ملاحظہ ہو امیر شکیب ارسلان کا (جو ان سے ذاتی طور پر واقف تھے) وہ ولولہ انگیز مضمون جو ان کی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" کے حواشی میں شامل ہے۔

[2] مثلاً شام، عراق، جنوبی یمن۔

لیکن چودھویں صدی کے وسط کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جب عالم اسلام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی روشنی نظر نہیں آتی تھی، بیداری کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی، اور بقول اقبالؔ ؎

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا — سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے — تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

عالم اسلام میں ایک طرف نمایاں طریقہ پر سیاسی شعور بیدار ہوا، غیر ملکی اقتدار کے خلاف جا بجا آزادی کا علم بلند کیا گیا جس کے نتیجہ میں مصر، شام (اپنے تمام حصوں کے ساتھ) عراق لیبیا، تونس، الجزائر، اور مراکش آزاد ہوئے، افریقہ میں نئی نئی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، انڈونیشیا، اور ملیشیا نے آزادی حاصل کی، پاکستان کی عظیم اسلامی مملکت کا وجود عمل میں آیا، ہندوستانی مسلمانوں نے جنگ آزادی میں شریک ہو کر، اور قربانیاں دے کر، سیاسی شعور اور حب الوطنی کا ثبوت دیا، اور بالآخر دنیا کے سیاسی نقشہ پر ۴۵ سے اوپر آزاد مسلم ممالک اور سلطنتیں نمودار ہوئیں، جن میں سے ۴۲ اقوام متحدہ کی ممبر ہیں، اور ان کے جھنڈے یونائیٹڈ نیشن کی پر شکوہ عمارت پر لہرا رہے ہیں، مسلمان اقوام متحدہ میں بھی، اور بین الاقوامی مسائل و مذاکرات میں بھی، اور دنیا کے سیاسی ترازو کے پلڑے میں بھی اپنا ایک خاص وزن رکھتے ہیں، اور اگر ان کا سیاسی شعور بالغ اور ان کو اپنی سیاسی طاقت و وزن کا احساس ہو، اور وہ متحد ہو جائیں، تو دنیا میں بہت سی ناانصافیوں کو روک سکتے ہیں، بہت سی کمزور اور مظلوم قوموں، اور ملکوں کی مدد کر سکتے ہیں، اگر خدا ان کو خدا ترس مخلص قائد و سربراہ

عطا فرمائے، یا اس کے قائدین اور سربراہان مملکت کو توفیق اور ہدایت نصیب فرمائے تو وہ ان اسلامی ممالک اور اپنے دائرۂ حکومت میں صحیح اسلامی حکومت قائم اور نظام شرعی کو نافذ اور جاری کر سکتے ہیں، اور اپنی قلمرو اور حدود حکومت میں وہ معیاری مسلم معاشرہ، اور وہ پاکیزہ، بلند کردار، اطاعت شعار، ذمہ دار اخلاقی و روحانی ماحول پیدا کر سکتے ہیں جس کی مثالیں صرف تاریخ کے صفحات میں صدیوں کے فاصلہ سے نظر آتی ہیں، اور جن سے دنیا یکسر مایوس اور خود مسلمان غافل اور مستغنی ہو چکے ہیں، اور جو آج بھی ذہن انسانی کو چونکانے اور مغرب و مشرق کے بلاکوں کو مسئلہ پر غور کرنے پر مجبور اور اشاعت اسلام کے لئے ایک نیا راستہ ہموار کر سکتا ہے، اسی طرح اگر وہ اپنے سیاسی وزن و اہمیت کا صحیح استعمال کرنے کا عزم کر لیں، اور اپنے فرائض و ذمہ داریوں کا مکمل طریقہ پر احساس کریں تو وہ اس انسانیت کو بھی تباہی سے بچا سکتے ہیں جس کی قسمت کے مالک بہ زعم خود مغربی و مشرقی بلاک بنے ہوئے ہیں، اسی طرح ہندوستان میں بھی وہ اپنی دانشمندی، اتحاد اور اخلاقی طاقت سے نہ صرف اپنے ملی حقوق کا تحفظ کر سکتے ہیں، بلکہ ہندوستان کو بھی ایک نئی اخلاقی، روحانی قیادت عطا کر کے اس عام تباہی سے بچا سکتے ہیں، جو روز افزوں سیاسی انتشار، اور خطرناک اخلاقی بحران کی بنا پر اس کی طرف منہ پھیلائے ہوئے بڑھ رہی ہے۔

دوسری طرف عالم اسلام میں وہ چند وسیع و طاقتور، اصلاحی، فکری، اور انقلابی تحریکیں پیدا ہوئیں جن کی نظیر اپنی وسعت و قوت میں ماضی قریب میں بھی ملنی مشکل ہے، ان تحریکوں کا ایک درخشاں اور امید افزا پہلو یہ ہے کہ وہ ایک طرف خواص، ذہین،

(INTELLECTUAL) طبقہ کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، اور اس طبقہ کو مطمئن کرنے اور اس کا اسلام پر اعتماد بحال کرنے کے لئے، واضح اور پرکشش علمی مواد فراہم کرتی ہیں، دوسری طرف ان کا دائرہ جغرافیائی حدود سے آزاد ہے، اور وہ عالم اسلام کے ایک بڑے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہیں، یہ پہلو بھی قابل لحاظ ہے کہ ان تحریکوں سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ پہلی مرتبہ نہ صرف متاثر، بلکہ اپنے دیرینہ سال ہم مذہبوں کے مقابلہ میں ان کا زیادہ پرجوش داعی اور مبلغ ہے، اس سلسلہ میں مصر کی عظیم و جلیل تحریک "الاخوان المسلمون" ترکی کی نوری تحریک و جماعت، اردن و فلسطین کی تحریک "حزب التحریر" انڈونیشیا کی ماشومی پارٹی، برصغیر کی عالمگیر تبلیغی دعوت، اور تحریک جماعت اسلامی کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے جن سے خواہ کسی کو کلی اتفاق نہ ہو، ان کی اثر انگیزی، اور وسعت و مقبولیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تعلیم یافتہ طبقہ اور نوجوانوں میں اس ایمان افروزی، ہمت آفرینی، اور خود شناسی میں اقبال کے ولولہ انگیز اور خیال افروز کلام کا بھی بڑا دخل ہے جس کی اپنی قوت و تاثیر اور عالمگیری میں پچھلی صدیوں کے اسلامی ادب و شاعری میں مثال نہیں ملتی۔

پندرھویں صدی اب پورے عالم پر سایہ فگن ہو گئی ہے، اگر ملت اسلامیہ، اور عالم اسلام اس عظیم سرمایہ، اور اس اعتقادی، فکری، علمی، سیاسی، طبعی اور انسانی ثروت و صلاحیت، طاقتور تحریکوں اور کثیر التعداد آزاد ملکوں، اور وسیع سلطنتوں سے بھی محروم ہوتا جس کی طرف کچھ مختصر اشارے اوپر کئے گئے ہیں، تب بھی خدا کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہ تھی کہ اس کے پاس قرآن مجید کا یہ صحیفہ، اور اللہ کا آخری، اور ابدی دین (اسلام) موجود ہے

جس کی وجہ سے ہر زمانہ میں ملت کے تن مردہ، اور قلب افسردہ میں زندگی کی نئی روح پیدا ہوتی رہی ہے، اور معجزات و عجائبات کا ظہور ہوا ہے۔

پھر مسلمان ہی اس دور میں تنہا انسانیت کی امیدوں کی پناہ گاہ، خدا کا آخری پیغام اور انسانیت کے امین و پاسبان ہیں، شاید یہ صدی ایک ایسا فیصلہ کن موڑ لائے جو پورے عالم انسانی پر اثر انداز ہو، اللہ کی رحمت سے ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے، انسانیت کی زبوں حالی، انسانوں کی ذلت و نگوں ساری، اپنے آخری نقطہ پر پہونچ چکی ہے، یہی وقت ہوتا ہے جب رحمت الٰہی بلکہ غیرت الٰہی کو حرکت ہوتی ہے، اور دنیا میں کوئی بڑا انقلاب آتا ہے۔

"مغربی تہذیب کو پورے طور پر گھن لگ چکا ہے، وہ اب محض اپنی صلاحیت، اور زندگی کے استحقاق کی بنا پر نہیں جی رہی ہے، بلکہ اس لئے کہ بدقسمتی سے کوئی دوسری تہذیب اس کی جگہ لینے کے لئے تیار نہیں، اس وقت جتنی تہذیبیں یا قیادتیں ہیں، یا مغربی تہذیب کی لکیر کی فقیر، اور اس کی ایک روکھی پھیکی تصویر ہیں، یا اتنی کمزور اور شکست خوردہ ہیں کہ اس سے آنکھیں نہیں ملا سکتیں، اب اگر اسلامی ممالک، اور عالم اسلام مجموعی طور پر اس خلا کو پر کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکے جو مغربی تہذیب کے خاتمہ سے عالم انسانی میں پیدا ہوگا، تو اس کو دنیا کی امامت کا دوبارہ منصب تفویض کیا جا سکتا ہے، جو سنۃ اللہ کے مطابق ایک جری و قوی اور تازہ دم ملت یا قیادت کے سپرد کیا جاتا رہا ہے، اب ان قائدین کو یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ کیا مغرب کی دائمی غاشیہ برداری، اور کشکول گدائی مناسب ہے، یا دنیا کی رہنمائی کا

منصب عالی، اور عالم انسانی کی ہدایت کی مسند رفیع جس سے (نبوت کے بعد) بڑھ کر کوئی سرفرازی اور سربلندی نہیں، کیا اس کے لئے ظاہری نام نمود، عہدہ و منصب، لذت و راحت، اور مادی و جسمانی ترغیبات کی قربانی کوئی حقیقت رکھتی ہے، اگر اس کے لئے سو جانیں بھی قربان کی جائیں تو درحقیقت گھاٹے کا سودا، اور زیاں و نقصان کا معاملہ نہیں ؎

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں[1]"

میں اپنے اس مختصر جائزہ، اور اس مخلصانہ پیغام کو اقبال کے ان روح پرور، اور حیات آفریں اشعار پر ختم کروں گا، جن میں انھوں نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا ہے ؎

ناموس ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی
اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی — صہبائے یقین درکش و از دیر گماں خیز
معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

---

[1] واوین کے درمیان کا حصہ مصنف کی کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" ص ۲۹۳ سے ماخوذ ہے۔

پندرہویں صدی میں عالم اسلام کے لئے دس نکاتی پروگرام

ساتویں صدی اور دسویں صدی ہجری میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے جو واقعات اور اسباب بیان کئے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ کو ہر دور میں ایسے ربانی، حقانی، بیدار مغز، عالی ہمت مصلحین اور داعیوں کی ضرورت ہے، جو دعوت الی اللہ اور نفوس قدسیہ کی اصلاح و تربیت کا کام ناسازگار سے ناسازگار ماحول میں انجام دیں، جب اسلامی حکومتیں زیر و زبر ہو رہی ہوں، مادیت اور خواہشات نفسانی کے سیلاب بلا میں لوگ تنکوں کی طرح بہے چلے جا رہے ہوں، مال و دولت کے حصول کی ایک اندھی "ریس" جاری ہو، وہ گرتے ہوئے دلوں کو تھامنے، اللہ تعالیٰ سے ان کو جوڑنے، اور ان میں تازہ ایمان و یقین، محبت اور خوف الٰہی اور اعتماد و توکل پیدا کرنے کے کام میں لگ جائیں، وہ لوگوں کو پست اغراض سے بلند رہنے کا سبق دے رہے ہوں، دنیا کے مال و متاع کی حقارت ان کے دل میں جاگزیں کر رہے ہوں، دولت و حشمت اور سلطنت و قوت کے سامنے سرنگوں اور سجدہ ریز ہوتے ضمیر و ملت فروشی اور ملکوں اور قوموں کا سودا کرنے سے بیزار اور بالاتر بنائیں، اور عقیدہ و اصول کے لئے قربانی اور راہ خدا میں شہادت کی آرزو سینوں میں بیدار

کردیں، ناامیدیوں کے گھٹاٹوپ اندھیرے سے نکال کر رحمت و نصرت الٰہی کی روشنی میں لے آئیں، زوال آمادہ اور کرم خوردہ معاشرہ کو ایسے اہل، طاقتور اور امانت دار اشخاص مہیا کریں جو حکومت کی نازک سے نازک ذمہ داریوں کو سنبھال سکیں، اور اسلام کی سرحدوں کی حفاظت و نگہداشت کر سکیں" یہ وہ ربانی حقانی لوگ ہیں جو اپنے معاشرہ و ماحول میں وہ خدمت انجام دیتے ہیں" جو خواجہ حسن بصریؒ نے بنو امیہ کے دور میں اور حافظ ابن جوزیؒ حجۃ الاسلام غزالیؒ اور سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ نے عباسیوں کے دور میں انجام دی تھی۔

ان ربانی اشخاص کا وجود ہر ملک اور ہر زمانہ کی بنیادی ضرورت ہے، وہ اس وقت کامیاب و بامراد ہوتے ہیں، جب حکومتیں ناکام و نامراد ہو جاتی ہیں[1]، ان کا علم دولت و اقبال

---

[1] پروفیسر ہٹی HITTI نے (جیسا کہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب "تاریخ مشائخ چشت" میں نقل کیا ہے) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ:

"سیاسی اسلام" کے نازک ترین لمحات میں "مذہبی اسلام" نے بعض نہایت شاندار کامیابیاں حاصل کیں (HISTORY OF THE ARABS, P-475)

یعنی اسلام نے ایک دین اور جاوداں پیغام کی حیثیت سے کامیابی و کامرانی حاصل کی، جبکہ اسلام ایک نظام حکومت کی حیثیت سے بعض اوقات شکست و ہزیمت سے دوچار ہوا، واضح رہے کہ اسلام میں دین وسیاست کی کوئی تفریق نہیں ہے، جیسا کہ ہٹی کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے۔

یہی بات ہالینڈ کے ایک فاضل مورخ لوکے گارڈ FRCIDE LOKKE GAARD نے بھی کہی ہے، وہ لکھتا ہے: "گو اسلام کا سیاسی زوال تو بار رہا ہو لیکن روحانی اسلام میں ترقی کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا"

اس وقت بلند ہوتا ہے جب حکومتوں اور طاقتوں کے فلک بوس جھنڈے سرنگوں ہو جاتے ہیں، اسلامی معاشرہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ ان نفوس قدسیہ سے سراسر محروم ہو جائے، بہت سے وہ اسلامی اور عرب ملک جہاں اللہ تعالےٰ نے رزق اور اپنی نعمتوں کے دہانے کھول دیئے ہیں، وہاں آج بشدت یہ "دعوتی و روحانی خلاء" محسوس ہوتا ہے، یہ خلا وسیع تنظیمات، عظیم علمی اداروں، سیاسی و اشاعتی سرگرمیوں، فلک شگاف نعروں اور خدمت دین کے بلند بانگ دعووں سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔

دینی دعوت اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو کوششیں دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں، مختلف انداز سے، اور اپنی اپنی بصیرت، تجربے اور حالات کے تقاضہ سے ہو رہی ہیں ان کو اپنے اپنے مرتبے پر رکھتے ہوئے، اور ان کی کسی نہ کسی درجہ میں افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے، اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پندرہویں صدی ہجری میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور مسلم معاشرہ کو مزید انحطاط و زوال کے خطرے سے بچانے اور نئی صدی ہجری کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کچھ معین نقاط (POINTS) اور چند واضح خطوط (LINES) (خواہ اُن کی حیثیت اشارات اور عنوانات سے زیادہ نہ ہو) پیش کر دیئے جائیں، شاید با توفیق اور بلند حوصلہ کارکنوں اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے فکرمند جماعتوں کو اُن سے کچھ روشنی یا مدد حاصل ہو:۔

۱۔ مسلم عوام میں ایمان و عقیدہ کو طاقت پہنچانے (جس کی چنگاریاں اس کے خاکستر میں بہرحال موجود ہیں) اور ان کے دینی شعور کو بیدار و متحرک بنانے کی ضرورت

ہے، ان مسلم عوام کی اسلام کے ساتھ وابستگی اور اس کے لئے گرم جوشی (خواہ وہ بعض اوقات حالات و حوادث ہی کا نتیجہ ہو) ایک ایسی بلند و مستحکم فصیل اور اسلام کا آہنی حصار ہے، جس کی بدولت بہت سی مسلم (یا مدعی اسلام) قیادتوں اور حکومتوں کو کھل کر کفر کا راستہ اختیار کرنے اور اپنے ملکوں اور ماتحت مسلم قوموں کو کفر و الحاد کی آغوش میں ڈال دینے کی ہمت نہیں ہوتی، اور اسلام ان تمام سازشوں اور منظم اور وسیع منصوبوں کے باوجود جو اس کو ان ملکوں سے بے دخل کرنے کے لئے اندرون یا بیرون ملک تیار کئے جاتے ہیں، ان ملکوں میں زندہ اور کسی نہ کسی درجہ میں فعال اور مؤثر ہے، خدانخواستہ اگر کسی دن یہ حصار ٹوٹ گیا اور مسلم عوام کا رشتہ، اور ان کی روحانی اور جذباتی وابستگی اسلام سے ختم ہو گئی تو پھر ان ملکوں میں اسلام کے بقا اور تحفظ کی کوئی ضمانت، اور اُن قیادتوں (LEADER SHIPS) اور حکومتوں کے کُھل کھیلنے اور اپنے ملکوں کو اسپین اور ترکستان بنا دینے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، پھر یہی عوام اور نرم اور بار آور زمین ہے جس سے ہر طرح کی قدرتی دولت حاصل کی جاسکتی ہے اور اس پر ہر طرح کے پر ثمر باغات لگائے جاسکتے اور محل تعمیر کئے جاسکتے ہیں، یہ وہ خام مال (RAW MATERIAL) ہے، جس سے بہترین انسانی مصنوعات تیار کی جاسکتی ہیں، اور مردم سازی اور آدم گری کا کام کیا جاسکتا ہے، صدہا خامیوں اور قابل اصلاح پہلوؤں کے باوجود یہ وہ انسانی مجموعہ ہے جس پر پیغمبرانہ توجہات اور اہل قلوب اور اہل خلوص کی محنتیں صرف ہوئی ہیں، اور وہ آج بھی اپنے خلوص قلب، اپنی محبت اور گرم جوشی اور ایثار و قربانی کے جذبہ اور صلاحیت

ہیں دوسری انسانی جماعتوں اور مذہبی قوموں سے فائق و ممتاز ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ اس کی ضرورت ہے کہ ان مسلم عوام (MASSES) اور مسلم ممالک کی مسلم آبادی ہیں ان صفات کو بھی پیدا کرنے اور اس اسلامی سیرت کو بروئے کار لانے کے لیئے بھی سخت جد وجہد کی جائے، جن کی بنا پر انسانی نفوس، نصرت آسمانی اور فتح و کامرانی کے مستحق ہوتے ہیں اور جن کی وجہ سے مخالفتوں اور رکاوٹوں کے پہاڑ گرد وغبار بن جاتے ہیں، مثلاً صحیح عقیدہ، توحید خالص جو شرک کے شائبہ سے محفوظ ہو، اسلامی سیرت اور اسلامی معاشرہ جو جاہلی رسم ورواج اور غیر مسلم اقوام کی تقلید سے پاک ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مسلم معاشرہ کو اس مرضِ نفاق اور اس "تضاد" سے پاک کیا جائے، جو عرصہ سے اس میں سرایت کئے ہوئے ہے، اور جو اسلام کی اصل تعلیمات' اور مثالی مسلم معاشرہ کے منافی ہے، اسی طرح اُن کے اخلاق وعادات اور نفس امارہ کو دولت و طاقت کے ان اثرات سے بھی اس کو بچانے کی کوشش کی جائے جن کی بنا پر انبیاء سابقین کی بہت سی امتیں مستحقِ عذاب اور موردِ غضب الٰہی ہوئیں، اسی طرح مغربی اقوام کے اس "اخلاقی جذام" سے بھی ان کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جائے جس میں مغربی تہذیب اور اہلِ مغرب مبتلا ہیں، اور اب وہ چاہتے ہیں مشرقی اقوام اور بالخصوص مسلم ملکوں میں بھی وہ پوری طرح پھیل جائے۔

لیکن یہ اصلاحی کام ادھورا رہے گا اور اس کے صحیح نتائج ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ مسلمانوں میں صحیح دینی شعور پیدا کیا جائے اور ان کو صحیح ذہنی تربیت نہ ہو، ضرورت

ہے کہ ان میں حقائق اور مسائل کا صحیح فہم اور دوست و دشمن میں تمیز کی صلاحیت پیدا ہو، ان کا شعور اتنا بالغ اور ان کا دینی فہم اتنا عمیق ہو کہ وہ گہرے سیاسی مقاصد رکھنے والے رہبروں، سیاسی بازی گروں اور کھوکھلے نعروں سے دھوکہ نہ کھائیں اور عالم اسلام میں پھر روح فرسا المیوں (TRADGADIES) کا اعادہ نہ ہو، جن میں بعض بڑی پرجوش مسلم قومیں اور ممالک، جاہلی قوم پرستی (NATIONALISM) یا لسانی (LINGUISTIC) اور ثقافتی (CULTURAL) تعصبات کی آندھیوں میں پتّوں کی طرح اڑ گئے، اور آسانی کے ساتھ شاطر قیادتوں اور غیر ملکی سازشوں کا شکار ہو کر اپنی سادگی اور شعور کی ناپختگی کے بھینٹ چڑھ گئے[1]۔

۲۔ دینی حقائق اور قرآنی و ایمانی اصطلاحات کو، نیز دین کے صحیح تصور اور فہم کو ہر طرح کی تحریف سے بچایا جائے، اور ان کو جدید عصری و مغربی تصورات اور سیاسی و اقتصادی نظاموں کے (بے اعتدالی کے ساتھ) تابع اور مطابق بنانے اور اسلام کی خالص سیاسی تشریح و تعبیر اور اسلام کو ایک نظریۂ حیات ثابت کرنے، اور عصری فلسفوں، سیاسی نظاموں کی سطح پر لے آنے میں شدید احتیاط برتی جائے، اس لئے کہ حکومت و اقتدار اور نظام و فلسفہ، تغیر و ترقی پذیر چیزیں ہیں، لیکن یہ دینی حقائق اور دین کا صحیح عقیدہ اسلام کی دائمی بنیاد اور وہ نقطہ ہے جس سے اس کا آغاز اور انجام

[1] ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "لسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق"، شائع کردہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ، (اردو، عربی، انگریزی، بنگالی ایڈیشن)

مربوط ہے۔ انبیاء علیہم السلام نے اپنے اپنے زمانہ میں انہیں کی دعوت دی. اور انہیں کے راستہ میں ان کی ساری جدوجہد اور جہاد تھا۔ اسی طرح ہر ایسی چیز سے احتیاط ضروری ہے جسکی بنیاد "ایمان بالآخرۃ" پر نہ ہو اور جس سے حصولِ رضائے الٰہی کا جذبہ کمزور، اور ایمان واحتساب[1] کی روح مضمحل ہوتی ہو، اور تقرب الی اللہ زندگی کی اصل غایت نہ ٹھہرتی ہو، نیز جس تعلیم وتلقین اور تفہیم وتشریح سے دورِ جاہلیت کی بت پرستی (جو ابھی زندہ ہے) اور شرک اور اس کے عام اعمال ومظاہر کی قباحت ونفرت کم ہوتی ہو، اور اس کو دورِ جاہلیت کی ایسی یادگار سمجھنے کا ذہن پیدا ہوتا ہو، جس کا زمانہ لدگیا، اور جس کی اب اس ترقی یافتہ دور میں کوئی گنجائش نہیں[2] حالانکہ بقول اقبال ؎

اگرچہ پیر ہے مومن، جواں ہیں لات ومنات

۳ - ذاتِ نبوت (علیہ الف الف سلام) سے مسلمان کے روحانی اور جذباتی تعلق پیدا ہونے اور برقرار رہنے کی کوشش، دل میں آپ کے لئے گہری محبت، اور مسلم معاشرہ میں عشقِ نبوی پیدا کرنے کی کوشش جو ایک مسلمان کی نظر میں آپ کو

---

[1] کسی کام کو محض اللہ کے وعدوں پر یقین اور اس کے موعود اجر وثواب کے لالچ میں انجام دینے کو "احتساب" کہتے ہیں۔

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین"۔ (اردو، عربی، انگریزی)

اہل وعیال یہاں تک کہ اپنی ذات سے زیادہ محبوب بنادے، جیسا کہ صحیح احادیث کے مطابق وہ ایمان کا تقاضہ اور اس کی علامت ہے، اور اس بات پر ذہنی طور پر پورا اطمینان اور اعتماد کہ آپ "ختم الرسل، مولائے کل، دانائے سبل" ہیں اور ایسے تمام اثرات سے احتراز جو محبت کے ان سرچشموں کو خشک وپایاب، سنت پر عمل کرنے، اسوۂ رسول کی پیروی اور سیرت کے مطالعہ کے شغف اور اس کے تاثر کو کمزور کردیں، یہی وہ وابستگی اور گرویدگی تھی جس نے عجمی قوموں کو اسلام کے رشتہ سے منسلک اور غیر اسلامی تہذیب اور قومیتوں میں تحلیل ہو جانے سے محفوظ رکھا۔

یہ پہلو اس زمانہ میں ممالک عربیہ کے لئے خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے جہاں پچھلے برسوں میں عرب قوم پرستی کی تحریکوں، عیسائی اور یہودی مصنفین کی کتابوں اور جدید عرب ادیبوں اور ان داعیوں و فضلا نے جو محبت کے عنصر سے محروم یا مقام "محمد عربی" سے ناآشنا تھے، اس کو اس حد تک کمزور کردیا ہے کہ اب اس کے دوبارہ احیاء اور تقویت اور ایک ایسے ایمان افروز اور روح پرور اسلامی ادب کی ضرورت پیدا کر دی ہے[1]، جس کے پیش کرنے والے ایک عجمی عاشق رسول (اقبال) کے الفاظ میں کہہ سکیں کہ ؎

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوت خیر دست

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب "الطریق الی المدینۃ" یا اس کا ترجمہ "کاروان مدینہ"۔

۴۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ ہیں، اور جن کے ہاتھ میں آج ممالک اسلامیہ کی فکری، تعلیمی قیادت اور ذرائع ابلاغ ہیں، اسلام کی ہر زمانہ میں رہنمائی کرنے، نئے نئے مسائل کا سامنا کرنے، نئی نئی گتھیوں کو سلجھانے، اور انسانی قافلہ کو اس منزلِ مقصود پر پہنچانے اور کشتئ حیات کو کنارہ لگانے کی صلاحیت پر اعتماد کی بحالی، جو غلط تعلیم اور مغربی افکار کے اثر سے یا تو ختم ہو گیا ہے، یا متزلزل ہو چکا ہے اس طبقہ نے فرض کر لیا ہے کہ اسلام ایک ایسی بیٹری یا ٹارچ ہے جس کا مسالہ ختم ہو گیا ہے، یا ایک ایسی بتی ہے جس کا تیل ختم، اور اس کا فتیلہ جل چکا ہے، اس کے دل میں از سرِ نو یہ اعتقاد اور اعتماد پیدا کرنا کہ اسلام ایک عالمی اور جاوداں پیغام ہے۔ جس میں زمان و مکان کی کوئی تفریق نہیں، اس کی ہر زمانہ میں کشتئ نوح کی حیثیت ہے جو تنہا غرق ہونے سے بچا سکتی ہے۔

اس اعتماد کا اس طبقہ کے دلوں سے بالکل نکل جانا، یا اس کا کمزور پڑ جانا اس طبقہ کا وہ اصلی مرض ہے جو اس وقت اس کے اکثر خلافِ اسلام اقدامات، اور "اصلاحات" کا محرک اور اس ذہنی و تمدنی ارتداد کا سبب ہے، جس نے اس وقت پورے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور جس کی وجہ سے ان رہنماؤں اور اہلِ حکومت اور مسلم عوام کے درمیان وہ عمیق و عریض خلیج پیدا ہو گئی ہے، جو کسی طرح سے پر نہیں ہوتی اور جس کی وجہ سے ان ملکوں میں ایک شدید ذہنی تہذیبی اور معاشرتی کشمکش برپا ہے، جو کبھی کبھی بغاوں اور انقلابات پر

منتج ہوتی ہے۔

۵۔ اسلامی ممالک میں نظام و نصاب تعلیم کی بنیادی تبدیلی، اور از سرِ نو تشکیل جو ان مسلم اقوام و ممالک کے قد و قامت، قدر و قیمت، پیغام و فرائض اور اغراض و مقاصد سے پوری مطابقت رکھتی ہو، اور جو قطعاً کسی دوسرے ملک یا "کیمپ" سے درآمد نہ کی گئی ہو، بلکہ ان مسلمان ماہرینِ تعلیم اور ماہرینِ فنون کے اجتہاد و مطالعہ، اسلام کے عمیق و جامع فہم، اور بصیرت و تجربہ کا نتیجہ ہو، جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے خود ساختہ حدود و خطوط سے بالاتر اور آزاد ہوں، یہ ایک ایسا ضروری کام ہے جس میں مطلق تاخیر کی گنجائش نہیں، اس کے بغیر یہ اسلامی ممالک اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہو سکتے ہیں، نہ اپنے دماغ سے سوچنے کے قابل ہو سکتے ہیں، نہ اپنے عزم و ارادہ سے ان ممالک کا نظام چلا سکتے ہیں اور نہ ان ممالک کی دانش گاہیں، ادب و صحافت اور ذرائع ابلاغ، اسلام کے مزاج و روح، اور معاشرہ کی ضرورت کے مطابق فرض انجام دے سکتے ہیں[1]۔

۶۔ ایک ایسی طاقتور، عالمگیر، علمی و تحقیقی تحریک، جو جدید نسل کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ استوار کر سکے، اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے،

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کی اس عنوان پر مستقل تصنیف "نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ" یا اردو کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش"، عنوان "مغربی نظام تعلیم" اور "زہر کا تریاق" ص ۲۲۰ – ۲۳۴

اور اس حقیقت کو ثابت کر سکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے، وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے، جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے، جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی، اور انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصرِ حاضر کا وہ "تجدیدی" کام ہے جو اسلامی ملکوں، اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے، اور مغرب زدگی و تجدد کے اس دھارے کو روک سکتا ہے، جو عالمِ اسلام میں اس وقت پوری طغیانی پر ہے[1]

۷۔ اسلامی ممالک اور مسلم معاشرہ میں اس اسلامی تمدن کی کارفرمائی اور جلوہ نمائی کی کوشش جو اسلام کے اصول و مقاصد، طہارت و عفت، اعتدال، ذوقِ سلیم، قرآنی تعلیمات، اسوۂ رسول، اور قرونِ اولیٰ کی اسلامی زندگی، اور اسلام کے مثالی معاشرہ کے بہت سے محاسن کا جامع ہے، کسی ملک اور قوم کا محض عقائد و عبادات سے وابستہ رہنا، اور اس تمدن سے کنارہ کشی اختیار کر لینا جو ان دینی تعلیمات، اور ان کے وسیع، جامع اور لچکدار اصول کے ماتحت پروان پڑھا ہو، اور کسی اجنبی تمدن کا اختیار کر لینا، دین کو عبادت گاہوں اور مذہبی رسوم (RITUALS) میں

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، مصنف کی کتاب "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش"، عنوان "قانون اسلامی میں تدوینِ جدید کی ضرورت" صفحہ ۲۵۱ - ۲۵۵

محدود اور ان ممالک کو تہذیبی و معاشرتی ارتداد کے خطرے سے دوچار کر دینے کے مرادف ہے، جہاں تک ان مسلم ممالک کا تعلق ہے جو مغربی تہذیب کے زیرِ اثر ہیں، ان میں دانایانِ فرنگ کی سازش پورے طور پر کامیاب ہو گئی ہے، جنہوں نے ان ممالک کو چند عبادات اور اسلامی شعائر کو چھوڑ کر بالکل اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور حکومت کے دفاتر سے لے کر قومی زندگی کے تمام شعبوں اور دائروں، سکونتی مکانات اور ہوٹلوں میں بعض اوقات یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم کسی مسلم ملک میں ہیں، یا کسی خالص مغربی ملک میں، ملی تشخص اور دین کے ساتھ زندہ اور طاقتور ربط کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کے لئے پیدا کیا ہوا مخصوص تمدن اور طرزِ زندگی بھی ان ملکوں میں کارفرما ہو، کہ تمدن اور زندگی کا چولی دامن کا ساتھ ہے [1]

۸۔ عالمِ اسلام کی اس وقت ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایک ایسی فکری قیادت ابھرے جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور قوت و اجتہاد کے ساتھ سامنا کرے اور اس تہذیبِ جدید کے مختلف سانچوں، مکاتبِ فکر اور طریقہ ہائے عمل کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جو تقلید، نقل، غلو اور انتہاپسندی سے محفوظ، ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو، حقائق

---

[1] اس موضوع پر مصنف کا مستقل رسالہ ملاحظہ ہو" اهمیة الحضارة فی تاریخ الدیانات وحیاة اصحابها"، ص ۲۷۶ تا ص ۲۸۱ (مذہب کی تاریخ اور ان کے پیروؤں کی زندگی میں تمدن کی اہمیت) شائع کردہ دارِ عرفات رائے بریلی۔

اور وسائل قوت اور مغز کی طرف متوجہ ہو، اور اس کے ظاہری خول ہیں نہ الجھے، مغربی تہذیب اور عوام کے ساتھ خام مال (RAW MATERIAL) کا سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی طاقتور تہذیب کی عمارت تعمیر اور زندگی کا ایک ڈھانچہ تیار کرے جو اسکے مقاصد، اسکے عقیدے اور اسکے اصولِ اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو، یہ وہ انقلاب انگیز اور مجتہدانہ کام ہے جس کے بغیر عالمِ اسلام حقیقی طور پر آزاد اور خود کا نہیں ہو سکتا۔[1]

۹۔ ان حکومتوں کو جو مسلم اکثریت کے مالک ہیں دین پسند اور اسلام دوست عناصر سے برسرِ پیکار ہیں اور وہاں ایک معنوی و اقتصادی نسل کشی (GNO CIDE) کی مہم جاری ہے، اور اس پر اس ملک کے قائدین اور حکمرانوں کی (جو کسی فوجی انقلاب کے نتیجہ ہیں، یا کسی سازش کے ماتحت) حکومت و اقتدار ہیں آگئے ہیں۔ بہترین توانائیاں صرف ہو رہی ہیں۔ نیز بعض ان عرب ممالک کے سربراہوں کو جو دینی حقائق و مفاہیم اور شرعی احکام و نصوص ہیں ایسی تبدیلی لانا چاہتے ہیں جو ان کے سیاسی اغراض، شخصی کمزوریوں یا غیر ملکی منصوبوں کی کامیابی ہیں مدد کر سکیں، یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ یہ حکمتِ عملی بے نتیجہ، قومی سالمیت اور استحکام کے لئے مضر اور انتشار انگیز کوشش ہے، جو ہر مسلم ملک ہیں ناکام ہو چکی ہے، ان کو ان مقاصد اور کوششوں کی طرف متوجہ کرنا، جو ملک کے لئے حقیقی طور پر مفید اور اس کی طاقت و حفاظت کا ذریعہ ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "اسلامیت و مغربیت کی کشمکش" عنوان "عالمِ اسلام کا سب سے بڑا خلا"۔

اسی طرح سے ان مسلمان حکومتوں اور ان کے سربراہوں کو جنکے دل میں اسلام کی عزت و محبت ہے شریعتِ اسلامی کے نفاذ اور اسلامی قوانین کے اجراء پر اور اس مقصد کے لئے مناسب فضائل اور ماحول تیار کرنے پر آمادہ کرنا اور اس بات کا یقین دلانا کہ یہ تبدیلی خدا کی طرف سے فتح و نصرت اور معاشرہ میں سعادت و برکت پیدا ہونے کا موجب ہوگی۔

اسی کے ساتھ عالمِ اسلام میں ایک ایسی مرکزی قیادت کے عالمِ وجود میں آنے کی فکر و سعی جو "شورائیت" کے اسلامی اصول اور "تعاون علے البر والتقوی" کی بنیاد پر قائم ہو، اور اپنی اس کوتاہی اور محرومی پر کم سے کم تاسف و ندامت کہ اس وقت عالمِ اسلام خلافت کے اس ضروری ادارے اور اس مبارک نظام سے محروم ہے، جس کے قیام کے مسلمان مکلّف بنائے گئے تھے اور جس سے محرومی کا جرمانہ وہ مختلف شکلوں میں ادا کر رہے ہیں۔

۱۰۔ جہاں تک خالص غیر مسلم ممالک کا تعلق ہے وہاں اسلام کا ایسا مؤثر اور معقول تعارف اور اس طرح اسلامی دعوت کا پیش کرنا جو اسلام کے مزاج اور اس زمانہ اور ان کی قوموں کی نفسیات کے مطابق ہے، اس لئے کہ ان ممالک میں (صحیح دین اور روحانی و اخلاقی تعلیم کا خلا موجود ہونے اور تہذیبِ حاضر کی ناکامی کی وجہ سے) اسلام کے لئے روشن امکانات پیدا ہو گئے ہیں، اور اس کی اشاعت کا وسیع میدان پایا جاتا ہے۔

جہاں تک ان ممالک کا تعلق ہے جن میں مسلم اقلیتیں پائی جاتی ہیں وہاں مسلمانوں کو اپنی نئی نسل کی دینی تعلیم کے آزاد و خود کفیل انتظام، اپنے پرسنل لا[1] کے تحفظ، نئے نئے قوانین

[1] ملاحظہ ہو دینی تعلیمی کونسل اترپردیش اور مسلم پرسنل لا بورڈ (مونگیر) کی طرف سے شائع کیا ہوا لٹریچر۔

کے بارے میں بیدار مغزی اور خودداری کا ثبوت دینے کے ساتھ، ان ممالک کی اخلاقی قیادت کے خلا کو پر کرنے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ جس کو صرف وہی پر کر سکتے ہیں بلکہ جس کے ذریعہ سے وہ نہ صرف اپنی افادیت و ضرورت ثابت کر سکتے ہیں بلکہ اس بر سر انحطاط معاشرہ اور ان زوال پذیر ملکوں کے نجات دہندہ اور معمار بن کران کے محبوب رہنما اور محترم قائد بھی بن سکتے ہیں[1]۔ اور اس طرح اسلام کے لئے خدمت اور ان مسلمانوں کے لئے عزت و اعتماد کا راستہ کھل سکتا ہے، جو مخصوص سیاسی حالات اور گذشتہ تاریخ نے اگر بند نہیں تو سخت دشوار گذار بنا دیا ہے۔

تاریخِ انسانی بلکہ درحقیقت نسلِ انسانی کی اس نئی صدی کے آغاز میں ایسے مردانِ کار کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی ہے، جو نہ صرف اسلام بلکہ عصرِ حاضر کی ان ضرورتوں کی تکمیل کریں اور ایسے مجتہدانہ اور جرأت مندانہ اقدامات کریں جو تاریخ کے دھارے کو بدل دے، زمانہ کا حقیقت شناس، فراخ نظر اور کشادہ دل مورخ قلم ہاتھ میں لئے ہوئے اس انتظار میں ہے کہ وہ ان کارناموں کو سنہرے حروف سے لکھے اور ان کے انجام دینے والوں کو خراج عقیدت ادا کرے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مصنف کا رسالہ "تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو"، شائع کردہ "حلقہ پیام انسانیت"، لکھنو۔

اسلام

ایک تغیّر پذیر دُنیا میں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں "شعبۂ اسلامک اسٹیڈیز" کے زیرِ اہتمام
ایک چار روزہ سیمنار منعقدہ ۲۲ تا ۲۵ / جنوری ۱۹۷۷ء میں کی گئی دو اہم
افتتاحی واختتامی تقریریں

مولانا ابوالحسن علی ندوی

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی خودنوشت سوانح حیات:-

کاروانِ زندگی

ایک معلّم، مصنّف، مورّخ و داعی کی سرگزشت حیات

جس میں ذاتی زندگی کے مشاہدات و تجربات احساسات و تاثرات

اور ہندوستان اور عالم اسلام کے واقعات و حوادث

اور تحریکات و شخصیات

کے مطالعہ کا ماحصل

اس طرح گھل مل گیا ہے کہ وہ ایک دلچسپ و سبق آموز "آپ بیتی"

اور ایک مورخانہ و حقیقت پسندانہ "جگ بیتی" بن گئی ہے ــــ اور

چودھویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی کی تاریخ و سرگزشت کا

ایک اہم باب محفوظ ہو گیا ہے

جس سے مورخین بیش قیمت فائدہ اور دینی و علمی کام کرنے والے روشنی

اور رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں

مجلس نشریاتِ اسلام

ناظم آباد ۱ ○ کراچی ۱۸

مفکرِ اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ

کی چند اہم شاہکار تصنیفات

تاریخ دعوت و عزیمت مکمل (چھ حصے)
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر
منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک
تذکرہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات
تبلیغ و دعوت کا معجزانہ اسلوب
مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں
نئی دنیا امریکہ میں صاف صاف باتیں
جب ایمان کی بہار آئی
مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت
حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب
عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح
تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک
مطالعۂ قرآن کے مبادی اصول
سوانح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
خواتین اور دین کی خدمت
کاروان ایمان و عزیمت
سوانح مولانا عبد القادر رائے پوریؒ

نبی رحمت مکمل (دو حصے)
حدیث کا بنیادی کردار
معرکۂ ایمان و مادیت
پرانے چراغ (تین حصے)
ارکان اربعہ
نقوشِ اقبال
کاروانِ مدینہ
قادیانیت
تعمیرِ انسانیت
حدیث پاکستان
اصلاحیات
صحبتے با اہل دل
کاروانِ زندگی (سات حصے)
مذہب و تمدن
دستورِ حیات
حیات عبدالحیٔؒ
دو متضاد تصویریں
تحفۂ پاکستان
پاجا سراغ زندگی
عالم عربی کا المیہ

ناشر: فضلِ ربی ندوی — فون 6601817 - 6600896
مجلسِ نشریاتِ اسلام ناظم آباد مینشن ۔ا۔ کے ۔۳۔ ناظم آباد ۱ کراچی
اسٹاکسٹ: مکتبہ ندوہ قاسم سینٹر، اردو بازار، کراچی
فون - 2638917